تم میری زیست کا حاصل ہو

اقراء صغیر احمد

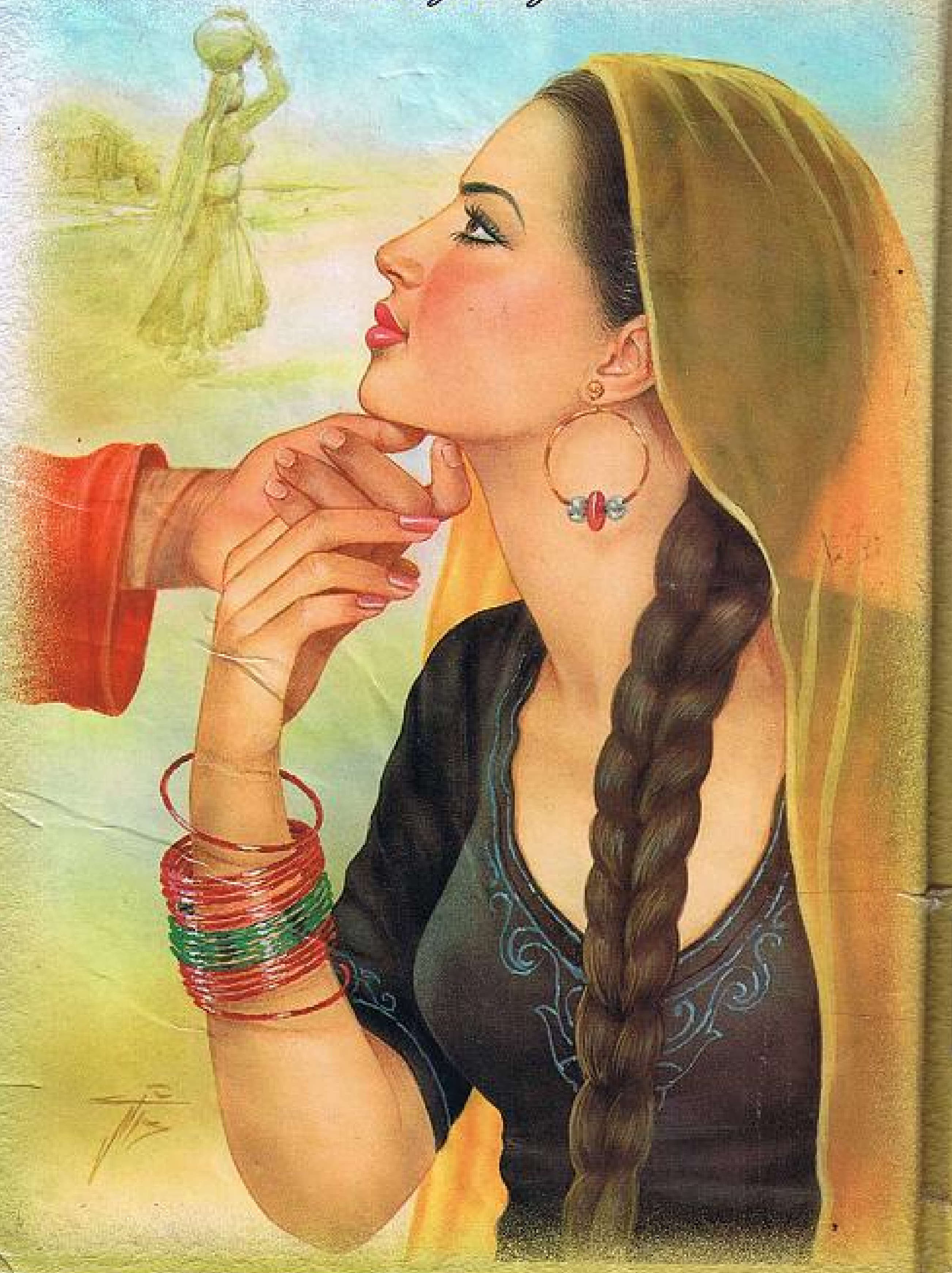

T010251767
METROPOLITAN
BRADFORD LIBRARIES
28.6.04

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام...... محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراول ——— 2004ء
مطبع ——— نیر اسد پریس
سرورق ——— ذاکر
کمپوزنگ ——— وسیم احمد قریشی
قیمت ——— -/100 روپے

''خضریٰ! کیا بات ہے بیٹی۔ کل رات سے دیکھ رہی ہوں، بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔''

''کوئی بات نہیں ہے انا بی! آفس میں آج کل کام بہت بڑھ گیا ہے اور......'' اُس نے دانستہ کوئی بات ہونٹوں سے باہر نکلنے سے روکی تھی۔

''اور کیا؟ کیا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟ کیا بات ہے؟'' انا بی چائے کا مگ ٹیبل پر رکھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر متفکر لہجے میں گویا ہوئیں۔

''میرے ساتھ یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ سے کوئی پرابلم چھپانا بھی چاہوں تو نہیں چھپا سکتی۔''

''اپنوں سے پریشانیاں چھپانا، ان کی محبتوں اور خلوص پر بے اعتمادی ظاہر کرتا ہے بیٹی۔ اور پھر میرا تمہارے سوا اور تمہارا میرے علاوہ کون ہے سوائے اللہ کی ذات کے۔ اگر ہم ایک دوسرے کو اپنی پریشانیوں اور مسرتوں سے باخبر نہیں رکھیں گے تو گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔''

''کل بڑے سر فارن ٹور پر لمبے عرصے کے لئے چلے گئے ہیں اور ان کے پیچھے آفس کا سارا سسٹم ان کے اکلوتے بیٹے شازل خان کے کنٹرول میں آ گیا ہے۔ آج سے تمام آفس وہی کنٹرول کرے گا۔'' از حد تفکر و پریشانی خضریٰ کے چہرے اور لہجے سے عیاں تھی۔

''بہت سخت مزاج کا ہے کیا وہ لڑکا؟''

''سخت مزاج نہیں بلکہ بہت رنگین مزاج کا مالک ہے۔ از حد بدفطرت اور عیاش۔''

"تمہیں اس کے مزاج سے کیا لینا بیٹی، جو تمہارا کام ہے اس پر ہی دھیان دینا۔"

"شانزل گروپ آف انڈسٹریز میں مجھے کام کرتے ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ بڑے سر تو صرف کام سے کام رکھنے والے بندے تھے۔ ثانیہ بتا رہی تھی پچھلے سال بھی شانزل خان بڑے سر کے بزنس ٹور پر جانے کے بعد آفس آنے لگا تھا اور اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے آفس کے تمام پورشنز میں رنگینیاں پھیلا دی تھیں۔ اور بھی بہت کچھ اس کے بارے میں ثانیہ نے بتایا ہے۔ میرا تو کل سے برا حال ہے، یہی سوچ کر کہ میں کس طرح فیس کروں گی اس شخص کو۔ یہ جاب کتنی پریشانیوں کے بعد ملی ہے پھر یہاں تنخواہ بھی خاصی مناسب ہے۔ اگر کہیں اور اچھی جاب ملنے کا ذرا بھی چانس ہوتا یا ہمیں جاب کی اتنی سخت ضرورت نہیں ہوتی تو میں کل ہی چھوڑ کر آ جاتی۔"

"اچھے اور برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو؟ جن لڑکیوں کو مجبوریاں گھر سے باہر قدم نکالنے پر مجبور کرتی ہیں وہاں اتنا حوصلہ و جرأت بھی بخشتی ہیں کہ وہ آگے آنے والی ہر مصیبت و پریشانی کا مقابلہ کر سکیں۔ یقین رکھو عورت اگر موم سے زیادہ نرم ہے تو فولاد سے زیادہ سخت بھی ہے۔ مرد لاکھ ضدی، ہٹ دھرم، طاقتور اور عیاش سہی، مگر اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے والی اور فولادی عزم رکھنے والی عورت کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ مرد جب عورت کی طرف بڑھتا ہے تو عورت کی رضامندی ہوتی ہے۔ ورنہ کسی مرد کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ عورت پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری ڈال سکے۔ اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔"

انا بی کی باتوں نے خاصی ہمت و جرأت پیدا کر دی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی کہ وہ خود کو نہ اس قدر نمایاں کرے گی کہ اس کی نگاہوں کا مرکز بنے اور نہ ہی اس قدر سنجیدگی سے کام کرے گی جو وہ بلاوجہ اس کی طرف متوجہ ہو۔

فیصلہ کرنے کے بعد تمام ٹینشن اور کنفیوژن سے آزاد ہو کر وہ بالکل ریلیکس ہو کر کام کر رہی تھی۔ ثانیہ حسب عادت گھریلو پریشانیاں ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ کمپیوٹر مانیٹر پر نگاہیں جمائے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

"ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ سر ابھی تک نہیں آئے۔ اس ٹائم تک ہمارا آدھا کام نمٹ چکا ہوتا ہے۔" اُس نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

اسی دم گیٹ کھلا اور براؤن پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ دراز قامت شخص دلکش مسکراہٹ کی روشنیاں بکھیرتا ہوا اندر داخل ہوا تو تمام اسٹاف باس کے احترام میں اسٹینڈ اپ ہو گیا۔ وہ بھی ثانیہ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہی وہ "شاہکار" ہے جس کا انتظار تھا۔ سب کے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ اپنے روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے کہ نام لیا اور شیطان حاضر۔" ثانیہ مسکرا کر بولی۔

ثانیہ کے ریمارکس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کی بورڈ پر اس کی انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں اور ذہن میں سوچوں کے انبار تھے۔ بظاہر تو اس شخص میں ایسا کوئی تاثر نظر نہیں آیا تھا جس سے اس کی بدکرداری کی کوئی رمق ملتی۔ بلکہ بڑے سر کی نسبت وہ کچھ بہتر ہی لگا تھا جو بہت خوشدلی سے سب کے سلام کا جواب مع مسکراہٹ کے دے کر گیا تھا۔

"خضریٰ بی بی، کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے میں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لیا کرو۔ کل ثانیہ سے اس کے بارے میں سن کر وہ اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ ساری رات اور صبح خوف و پریشانی میں گزاری تھی۔ اور اب ایک نگاہ میں اُس کی ظاہری شرافت و شائستگی سے نظریں متاثر ہو گئیں۔" اُس نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور مکمل توجہ مانیٹر پر مرکوز کر دی۔

⁂☆⁂

"آ گئیں بیٹی! کیسا لگا باس؟" انا بی جو گیٹ کے قریب ٹہل رہی تھیں، اُس کے سلام کا جواب دے کر بیقراری سے گویا ہوئیں۔

"میں اسی لئے آپ کو بتانا نہیں چاہ رہی تھی کہ میری غیر موجودگی میں آپ کا سارا وقت فکرمند ہوتے اور دعائیں مانگتے گزرا ہوگا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں دیکھنے میں تو ویسا ہی ہے جیسے کروڑ پتی گھرانوں کے اکلوتے لڑکے ہوتے ہیں۔ افکار و انتشار سے پاک زندگی، بہترین غذا اور زندگی کی تمام آسائشوں کی دستیابی جنہیں حسن، خوبصورتی اور حد درجہ اعتماد و طمانیت اور آسودگی بخشتی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن بظاہر ملنسار اور شریف لگ رہا ہے۔ مگر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جس طرح نظر آتے ہیں، ویسے ہوتے نہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے، میری دُعا مستجاب ہوئی اور آئندہ بھی اللہ کرم کرے گا۔ چلو آؤ میں نے آج چائے کے ساتھ پکوڑے بنائے ہیں اور ساتھ ٹماٹر کی چٹنی بھی بنائی ہے۔“

وہ خاصی مطمئن سی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔ خضریٰ کپڑے چینج کرنے روم کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں صوفے کے پاس رکھی ٹیبل پر پکوڑے کھانے میں مصروف تھی۔

”اپنے اوپر اعتماد رکھو۔ اگر آپ اچھے ہیں تو دوسرے کی برائی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”انا بی! آج کے وقت میں یہ فلسفہ کامیابی کی سند نہیں پا سکتا۔ اس دور میں ہم جن سے بچ کر چلنا چاہتے ہیں، وہی ہماری راہ کی بھاری رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔“

”ہمت نہیں ہارتے بیٹی۔“ انا بی نے بھاپ اڑاتا ہوا چائے کا مگ اس کے آگے رکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کرائے دار نے کرایا دیا؟ فیاض آنے ہی والا ہو گا۔“

”کئی بار تقاضا کر چکی ہوں۔ انہوں نے کل کا کہا ہے۔ دراصل بیٹی آج کل کے حالات تو دیکھ ہی رہی ہو، پہلے پڑوسی ملک پر امریکی حملے کے باعث ہماری معیشت پر کتنا اثر پڑا اور ابھی اس بحران سے نکلے بھی نہ تھے کہ دشمن ملک کے جنگی جنون نے اور زیادہ کاروبار پر برے اثرات ڈالے ہیں۔ ہر جگہ ایک افراتفری و اضطراب کی کیفیت ہے۔ ایسے میں وہ مجبور لوگ کہاں سے روزی کمائیں جو صبح سے شام تک کما کر لاتے ہیں تو گھر کا چولہا جلتا ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو روز

کنواں کھودتے ہیں اور پانی پیتے ہیں۔ آئے دن بیروزگاری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے والوں کی خبروں سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں، ایسا ہی ہوتا آیا ہے ہر دور میں۔ غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور امیر، امیر ترین۔“

”نہ معلوم کب ہمارے ملک میں خوشحالی آئے گی اور کرپٹ اور بے ضمیر لوگوں سے عوام کی جان چھوٹے گی۔ ہوشربا مہنگائی نے ہم جیسے لوگوں سے زندگی کا حسن چھین لیا ہے۔ ہر آنے والا دن فکر اور پریشانیوں کا سورج طلوع کرتا ہوا اُبھرتا ہے۔“ اُس نے مگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے دلگرفتہ لہجے میں کہا۔ انا بی اُس کے گردش معاش میں جکڑے چہرے کو دیکھ کر ملول سی رہ گئی تھیں۔

”رات کو کیا پکے گا؟“ وہ ان کو افسردہ دیکھ کر تیزی سے موڈ بدل کر گویا ہوئی۔

”کل کا سالن، چنے کی دال گوشت خاصا بچا ہوا تھا۔ میں نے اس میں دو آلو ابال کر ڈال کر پیس لیا۔ ٹھیک ٹھاک شامی کباب کا مصالحہ تیار ہو گیا ہے، ہرا مصالحہ ڈال کر کباب تیار کر کے رکھ دیئے ہیں۔ کھاتے وقت فرائی کر لیں گے، تب ہی تھوڑی سلاد اور رائتہ بنا لوں گی اور شامی کبابوں کے ساتھ پراٹھے اچھے لگتے ہیں، وہ بنا لوں گی۔“

”واہ! اس کو کہتے ہیں ٹو ان ون۔ کل دال گوشت آج وہ بن گئے شامی کباب اور کل میں بناؤں گی، ون ان تھری، یعنی کل دال گوشت، آج شامی کباب پراٹھے اور کل آفس کے لئے میں اس کے سینڈوچز بنا لوں گی۔“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تو انا بی بھی مسکرانے لگیں۔

✲☆✲

”آپ نے مجھے بلایا سر؟“ اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر قدم رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”یس، پلیز سٹ ڈاؤن۔“ شازل خان نے آگے رکھی فائل سائیڈ میں کھسکاتے ہوئے سامنے رکھی چیئرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تھینکس سر۔“

پانچ منٹ گزر چکے تھے اور وہ بالکل خاموش تھا۔ خضریٰ کو کنفیوژن ہونے لگی تھی۔ آخر اس کی خاموشی بلاوجہ تو نہ ہو گی۔ اُس کی گہری نگاہوں کا حصار وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

ایک ہفتہ ہوا تھا اُسے آفس جوائن کیے ہوئے اور اس ایک ہفتے میں تمام اسٹاف میں یہ واحد لڑکی ایسی تھی جو اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ اس کا رویہ اتنا محتاط و خشک ہوتا تھا کہ اس جیسے سرپھرے اور مشکل پسند بندے کی نگاہوں میں آ گئی تھی۔

''آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا سر؟'' بالآخر دس منٹ گزر جانے کے بعد اسے پوچھنا پڑا۔

''آپ مجھ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں؟'' بہت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر لفظ ادا کیے گئے۔

''م...... میں آپ سے خوفزدہ کیوں ہو گی سر۔'' اس کی صاف گوئی اُسے لمحے بھر کو بوکھلا گئی تھی۔ وہ شاید انسانی رویوں کا بہت گہرائی سے تجزیہ کرنے کا ماہر تھا۔

''یہی تو میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا رویہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ مجھے دیکھ کر آپ کے چہرے پر ایسے تاثرات اُبھرتے ہیں جیسے کسی گھٹیا ترین غنڈے، بدمعاش کو دیکھ کر انسان خود کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہاں آفس میں بھی آپ فائلز چیک کروا کر اس طرح بھاگتی ہیں جیسے مجھے کوئی خطرناک بیماری ہو جس کے جراثیم آپ کو لگ جانے کا خطرہ ہو۔ میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں کہ نہ مجھے کوئی بیماری ہے اور نہ ہی میرا فیملی بیک گراؤنڈ کسی بدمعاش سے وابستہ ہے۔'' اُس نے خاصے ٹھنڈے لہجے میں لفظ چبا چبا کر ادا کیے تھے۔

''آپ کو غلط فہمی ہے سر۔ میں بھلا کیوں یہ سب سوچوں گی۔ میں ایک بے حد معمولی سی ورکر ہوں، آپ کو میرے محسوسات کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔''

''میں آپ کو بریف کر دیتا ہوں کہ میرا اور ڈیڈ کے کام کرنے کا اسٹائل قطعی مختلف ہے۔ میں اسسٹنٹ سے واچ مین تک کی پرواہ کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں محنت سے کام

کرنے والے ورکرز سب قابل احترام و اہم ہیں، کوئی معمولی نہیں۔'' اُس کا نرم لہجہ شائستہ اور مہذبانہ تھا مگر آنکھوں سے نکلتی تپش اُسے سر جھکانے پر مجبور کر رہی تھی۔

''یہ فائل ہے آپ کی، اس میں تمام کوائف درج ہیں۔ بہت حیرت ہو رہی ہے مجھے یہ جان کر کہ آپ میرڈ ہیں۔ اس کے باوجود اس قدر محتاط و گریز پا رویہ حیران کن ہے۔ اب تو بیچلر گرلز بھی خاصی انڈیپنڈنٹ اینڈ ماڈ ہو گئی ہیں۔'' نامعلوم کب تک اس کا فضول ٹاپک چلتا کہ اُس کی گرل فرینڈ کے آ جانے کے باعث اُس کی خلاصی ہوئی۔

''ہائے ڈیئر! بزی ہو؟'' یلو پینٹ، بلیک سلیولیس شرٹ میں ملبوس ڈارک میک اپ میں اُس کا حسن دمک رہا تھا۔ بڑے والہانہ انداز میں وہ شازل خان کے شانے سے لگی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ باس نے خضریٰ کو جانے کا اشارہ کیا اور فق چہرہ لئے وہ لمحے بھر میں وہاں سے اپنے کیبن میں لوٹ آئی۔

''ارے...... کیا ہوا؟'' ثانیہ نے حیرت سے اُسے بدحواس سا دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

''لاحول ولاقوۃ، جو سین کبھی فلموں میں دیکھے تھے، اب وہ حقیقت میں دیکھنے کو ملیں گے۔'' اُس نے ثانیہ کو تمام باتیں گول کر کے شازل خان اور اُس کی فرینڈ کے ملنے کا انداز بتایا تو وہ بے اختیار ہنس کر بولی۔

''میری جان! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے سر تو بہت اوپن مائنڈڈ ہیں۔ وہ اپنی گرل فرینڈز سے کوئی فاصلہ رکھ کر ملنے کے عادی نہیں ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب آئے تھے تو یہاں ریسپشن پر شرمیلا سنگھ ایک غیر مسلم لڑکی تھی، ایجوکیٹڈ تو زیادہ نہ تھی مگر حسین بلا کی تھی۔ سر نے پہلے دن اسے دیکھا اور دوسرے دن وہ ڈائریکٹ ان کی پرسنل سیکرٹری کی سیٹ پر تھی اور پھر وہ تھے اور سیکرٹری صاحبہ۔ گھنٹوں وہ ان کے ساتھ آفس میں گزارتی تھی اور کسی کو آرڈر نہ تھا کہ پرمیشن کے بغیر وہاں چلا جائے۔ شرمیلا کے ساتھ سر کا افیئر چھ سات ہفتے چلا، وہ شروع شروع میں بہت عام سے ملبوسات میں آتی تھی مگر سر کی رفاقت نے تو اس کی تقدیر ہی بدل ڈالی۔ وہ راتوں رات فرش سے عرش پر جا پہنچی۔ اس نے کار لی، مہنگے علاقے میں کوٹھی خریدی اور بہت ٹھاٹ سے رہنے لگی تھی۔ سر کے ساتھ

کئی ہفتے وہ شمالی علاقوں میں بھی گزار کر آئی۔ پھر سر کی نگاہ انتخاب بڑے آفس کے سیکرٹری کی اسسٹنٹ پر پڑی۔ روحیلہ مسعود سے دوستی کا آغاز ہوا تو شرمیلا سنگھ کو ڈراپ کر دیا گیا۔ لیکن اس مدت میں شرمیلا نے اتنا بینک بیلنس بنا لیا کہ نہ صرف کار، کوٹھی کی مالک بن بیٹھی بلکہ اُس نے ایک پوش علاقے میں بہت جدید انداز میں بیوٹی پارلر کے ساتھ سلمنگ سینٹر کھول لیا۔ اب وہ یہاں سے ریزائن کر کے پارلر اور سینٹر چلا رہی ہے۔ روحیلہ مسعود سے بھی سر کی دوستی اسی طرح ہر حد کو پار کرتی ہوئی چند ہفتے قائم رہی اور اس نے بھی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ لی اور سر کی توجہ اگلے شکار کی طرف مرکوز ہوتے ہی وہ ملک سے باہر جا کر سیٹل ہو گئی۔ سر کے شکاروں کی لسٹ بہت طویل ہے اور اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی لڑکی کو زبردستی حاصل نہیں کرتے۔ لڑکیاں ہینڈسم، ڈیشنگ پرسنالٹی اور پھر دولت پر دل و جان سے مرمٹتی ہیں اور سر چند ہفتوں سے زیادہ کسی کو برداشت نہیں کرتے۔ لیکن لڑکیاں بہت قلیل عرصے میں دولت اور مہنگے ترین تحفے سمیٹ کر شاندار مستقبل بنا لیتی ہیں۔'' ثانیہ نے ٹائپ رائٹر کی جانب متوجہ ہونے سے قبل تمام باتیں گویا اس کے گوش گزار کر دی تھیں۔

''تمہاری معلومات میں اور اضافہ کروں، یہ جو محترمہ ابھی آفس میں آئی ہیں، یہ غیر ملکی ٹائپ کی ماڈل ہے، بلکہ گزشتہ سال کی مس یونیورس بھی ہے اور سنا ہے سر کی دوستی اس سے کچھ زیادہ ہی ''گہری'' ہے۔'' ثانیہ دوبارہ اُس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ ثانیہ کا بہترین مشغلہ تھا یہ۔ اسے دوسروں کے متعلق باتیں کرنے کا جنون تھا۔

''بائی گاڈ، چھوڑو اس قصے کو۔ ہمیں صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ فضول میں کیوں دوسروں کے بارے میں متجسس رہیں۔'' اُس نے سنجیدگی سے موضوع بدلنا چاہا۔

''تم میں نہ معلوم کون سی بوڑھی اور دنیا سے بیزار روح سمائی ہوئی ہے میری جان! کچھوے کی طرح اپنے خول میں بند رہنا چھوڑ دو، آپ دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتیں۔ بے ضرر اور بے وقوف لوگ اس دور میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، کبھی منزل پر نہیں

پہنچتے۔ اپنے اندر چینج لاؤ، اردگرد سے باخبر رہا کرو اور کچھ میگزینز وغیرہ بھی پڑھ لیا کرو۔ سر جھکا کر آنا اور سر جھکا کر جانا ترک کر دو بلکہ سر اٹھا کر چلا کرو۔''

''او کے مائی لارڈ۔ اگر آپ کے احکامات نما مشوروں کی فہرست ختم ہو گئی ہو تو میں اپنا کام شروع کروں؟'' خضریٰ مسکرا کر بولی تو ثانیہ ہنس پڑی۔

''اب سکون سے کام کریں گے۔ دیکھو سر اب کبوتری کے ساتھ اڑ رہے ہیں اور بھئی ان بڑے لوگوں کے بھی بڑے ہی مزے ہیں۔'' ثانیہ نے شیشے کے پار کوریڈور سے لفٹ روم کی طرف جاتے ہوئے شانزل خان اور ماڈل جینفر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

✲☆✲

گھر میں قدم رکھتے ہی سارے دن کی تھکن مزید بڑھ گئی جب اُس نے بڑے اطمینان سے رافع فیاض کو انا بی کے تخت پر دراز پایا۔

''اوہ! آ گئی تم، جبھی کہوں یہ روشنی کیوں ہر جگہ پھیل گئی ہے، فضا میں خوشبوئیں بکھر گئی ہیں۔ ماحول......''

''پلیز اسٹاپ اِٹ۔ مجھے نہیں سننی یہ تمہاری فضول بکواس۔ انا بی! یہ آدمی یہاں کیوں ہے؟ آپ نے اس کا حساب کیوں نہیں کیا؟'' ترش لہجے میں رافع سے مخاطب ہو کر وہ انا بی سے بولی۔ وہ کچن سے برآمد ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے۔

''بیٹی، کرائے دار کا کام نہیں ہے۔ دو ہفتے ہو گئے اس کی ملازمت ختم ہوئے۔ وہ خود بیوی بچوں کے ساتھ فاقے کر رہا ہے۔ اسے پیٹ بھرنے کو نہیں ہے، بے چارے کرایہ کہاں سے دیں۔''

''واہ، کنگلوں سے کنگلے ہی ٹکراتے ہیں، کیا کریں بھئی......''

''شٹ اپ، بہتر یہی ہو گا، یہاں سے تم دفع ہو جاؤ۔ تم جیسے ذلیل آدمی کی مکروہ شکل دیکھتے ہوئے بھی گھن آتی ہے۔'' وہ اس کی بات قطع کر کے نفرت انگیز لہجے میں غرائی تھی۔

"اب کیا کریں؟ مکروہ ہوں یا ممنوع، آدمی تمہارا ہی تو ہوں۔ تم نہ مانو یہ الگ......"

"ارے میاں! کیوں پریشان کرتے ہو۔ بچی پہلے ہی تھکی ہاری آفس سے آئی ہے، اوپر سے تم بک بک کر رہے ہو۔ جب کہہ دیا پیسے کچھ دن بعد آ کر لے جانا تو پھر جاؤ۔" انا بی خضریٰ کی مشتعل کیفیت دیکھ کر جلدی سے بولیں۔

"میں پچھلے ماہ سے یہ کچھ دن کی گردان سن رہا ہوں، اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے سیدھی طرح سے میرا روپیہ چاہئے یا پھر اپنی لاڈلی سے کہو، چل کر میرے ساتھ رہے۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اسے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ صبح شام بسوں کے دھکے کھا کھا کر جو اس کا روپ رنگ خراب ہو گیا ہے، ایک دم گلاب کے پھول کی مانند کھل جائے گا۔ یہ ایک دفعہ راضی تو ہو جائے میرے ساتھ رہنے کے لئے۔" رافع فیاض نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے خضریٰ کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کر چکے بکواس؟ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں ابھی رخسانہ کو فون کر کے بتا کر آتی ہوں کہ تم مجھے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو۔"

"ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے میری رقم مل جانی چاہئے۔ ورنہ پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

رخسانہ کی دھمکی آج بھی کارگر ثابت ہوئی اور وہ دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

"منہ ہاتھ دھولو بیٹی، میں اتنے میں گرم گرم پھلکے پکا کر لاتی ہوں۔ اسٹو بنایا ہے آج میں نے۔"

"نہیں، اب کھانا نہیں کھایا جائے گا مجھ سے۔ صرف ایک کپ چائے دے دیں۔" باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے حسب توقع خاصے پژمردہ لہجے میں کہا تھا۔ اور جب تک وہ باتھ روم سے حلیہ درست کر کے کمرے میں آئی، تب تک انا بی کچن سے فارغ ہو کر اس کے لئے بھاپ اڑاتا چائے کا مگ ٹیبل پر رکھے بیٹھی تھیں۔

"بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو۔ بہت کام تھا آج؟"

"کب سے آیا ہوا تھا وہ؟"

"ایک گھنٹہ ہوا تھا اسے آئے ہوئے۔"

"نہ معلوم کیوں ہم جیسے لوگوں کی مشکلات گزرتے وقت کے ساتھ دراز ہوتی جاتی ہیں۔ حرماں نصیبی و تنگ دستی کے منحوس سائے شاید موت کی آغوش میں پہنچا کر ہی ساتھ چھوڑیں گے۔" اُس نے مگ سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"ناامیدی مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہوتی بیٹی۔ رب کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی کو ترسا کر۔ مگر بندے کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ ہر رات کا سویرا ضرور ہوتا ہے۔ دکھوں کے بعد خوشیاں بھی رب کی طرف سے دامن بھر دیتی ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ دکھوں سے گھبراتے نہیں، ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی رحمت کی بارش ہم پر بھی برسے گی۔" اس کی افسردگی انا بی کو ہمیشہ ہی ملول و افسردہ کر دیتی تھی اور خاص طور پر وہ رافع فیاض کے آنے کے بعد تو ہفتوں پریشان رہتی تھیں۔ آج بھی وہ آیا تو انہوں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے چلا جائے مگر وہ بھی اپنے وقت کا ایک ڈھیٹ و بے حس آدمی تھا، جب تک خضریٰ کو جلا کر اس سے باتیں نہ سن لیتا، وہ جاتا ہی نہ تھا۔ اب انہیں معلوم تھا وہ ہفتوں پریشان رہے گی اور اس دوران کھانا پینا تو برائے نام ہی رہ جائے گا۔ اس کی فکر انہیں اپنی صحت سے زیادہ رہتی تھی۔

"انا بی! رافع فیاض کے آنے سے قبل زندگی اتنی دشوار تو نہیں تھی، اس شخص کے سائے نے میری زندگی دہکتی ہوئی دوزخ بنا ڈالی ہے۔ اس کی لالچی و حریص فطرت کو جانتی ہیں آپ، ایک ماہ اس نے نہ معلوم کس طرح صبر کیا ہے، اب ایک ہفتہ صبر کرنے والا نہیں ہے۔ وہ باہر گلی میں آ کر گدھے کی طرح چیخے گا اور لوگ نہ معلوم کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔ ایک عزت ہی تو ہم نے بنائی ہے زندگی میں۔ اگر وہ بھی چلی گئی تو سانسیں بند ہو جائیں گی۔ اور میں اس خبیث شخص کی قرض دار نہیں مرنا چاہتی۔"

”اللہ بڑا بادشاہ ہے، اس پر معاملہ چھوڑ دو، وہ خود حل کر دے گا۔“

”بے شک، اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے ہمارا۔ کرائے دار کی مکاریاں آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل کلر ٹی وی لایا ہے۔ کیا وہ ڈاکہ مار کر لایا ہے؟ جب اس کا کوئی کام نہیں ہے تو، اور صبح شام آپ کو اس کے کچن سے نت نئے کھانوں کی خوشبوئیں نہیں آتیں؟ کرایہ ادا کرنے کے لئے وہ فاقے مر رہا ہے۔ انا بی! لوگوں نے آج کل یہی ڈھونگ رچا رکھا ہے، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی روتے رہتے ہیں، ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، اپنی غرض پر منٹوں میں لاکھوں روپیہ اڑا دیتے ہیں۔ ان سے میں خود بات کروں گی۔“

”نہیں نہیں، تمہیں کسی کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بات کروں گی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بچے ضد کر رہے تھے تو بھائی کا ٹی وی کچھ دنوں کے لئے لایا ہوں۔ اچھا کل اس کا چھوٹا والا بیٹا تمہیں یہی بتا رہا ہو گا۔ توبہ توبہ...... کیسے بے ایمان لوگ ہیں۔ ایسے لوگ سچے مصیبت زدہ لوگوں کا یقین بھی گنوا دیتے ہیں۔ بس تم بے فکر ہو جاؤ، اب میں خود چند دن نظر رکھوں گی، پھر خود نمٹ لوں گی۔“

اس نے انا بی سے نظر بچا کر وہ سونے کے جڑاؤ کنگن نکال لئے جو امی نے بہت محبت سے اس کے لئے بنوائے تھے، سلائی اور گھریلو ضروریات کم سے کم کر کے۔ انہیں معلوم تھا ان کی بیٹی کو عام لڑکیوں کی طرح بھاری جیولری پسند نہیں ہے، وہ صرف نازک سے ایئر رنگ اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں پہننے کی خواہش بچپن سے ہی کرتی آئی تھی۔ انہوں نے روپیہ روپیہ جوڑ کر چار چوڑیاں اور دو جڑاؤ کنگن اُس کی شادی کے لئے بنوا لئے تھے۔ چار چوڑیاں رافع فیاض کو وہ دے چکی تھی اور ان کنگنوں کو اُس نے بہت محبت و احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ان سے اُسے ماں کی محبت اور خوشبو نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ از حد چاہنے والی ماں کو اس کے صدمے نے ہی تو دوسرے جہان پہنچا دیا تھا۔ ماں کی مشقتوں سے بنائی گئی نشانی اُسے دل و جان سے عزیز تر تھی۔ کنگنوں کے چمکتے نگوں میں ماں کی ممتا، مجبوری و لاچارگی سب نظر آتا تھا۔ جب بھی ماں کی زیادہ یاد

آتی، وہ ان کنگنوں کو نکال کر چومتی، انہیں سینے سے لگا کر گھنٹوں بے خود ہو جاتی۔ اسے لگتا ماں کی آغوش نے اسے ڈھانپ لیا ہے اور وہ پُر سکون ہو جاتی۔ اور اب مجبوری میں وہ انہیں فروخت کر کے رافع فیاض کی رقم دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ یہ واحد چیز تھی اس کے پاس فروخت کے لئے۔

وہ کنگن پرس میں ڈال کر آفس چلی آئی تھی۔ خاموشی اور عجیب گم صم سی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ کنگنوں سے دلی و جذباتی طور پر وابستگی نے اُسے مضطرب کر ڈالا تھا۔ شکر تھا کہ آج ثانیہ کسی وجہ سے آفس نہیں آئی تھی ورنہ وہ ضرور اس کی کیفیت نوٹ کر کے خوب سوالات کرتی اور مطمئن کرنے کے لئے نہ معلوم اسے کون کون سے بہانے بنانے پڑتے کہ اپنی خودداری و انا اُسے جان سے بڑھ کر عزیز تھے۔

”ایکسکیوزمی! اینی پرابلم؟“ شانزل خان کی آواز بہت قریب سے گونجی تھی۔

”سس...... سر! آپ یہاں؟ مجھے بلا لیا ہوتا۔“ اُسے اپنے بہت قریب کھڑا دیکھ کر وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں دو مرتبہ یہاں سے گزرا ہوں اور ہر بار آپ کو پریشان اور اُداس دیکھا ہے بلکہ رنجیدہ اور افسردہ، اردگرد سے قطعی بیگانہ، جیسے آپ کو کسی کی جدائی کا صدمہ ہو یا آپ جبراً کسی سے الگ ہو رہی ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور مسحور کن لہجے میں بول رہا تھا۔

خضریٰ اُس کی قیافہ شناسی پر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ بلا کا ذہین اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ از حد خامیوں کے علاوہ چند خوبیاں بھی اس کی ذات میں موجود تھیں لیکن وہ اس کی بے باک آزاد فطرت کے نظارے دیکھ چکی تھی، اس لئے اس پر کسی قسم کا اعتبار کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کا یوں کیبن میں بلا ناک کئے آنا بھی اسے ناگوار گزرا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں سر! آپ بتائیں، کیا کام ہے؟“

”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میرے اور ڈیڈ کے کام کرنے کا انداز بالکل جدا ہے۔ مجھے عام ورکر سے واچ مین تک کی پروا اور فکر ہوتی ہے۔ اگر کوئی سیریس معاملہ

ہے تو آپ مجھ پر اعتبار کرسکتی ہیں۔ آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔'' اُس نے فراخدلانہ پیشکش کی۔

''تھینک سر! بہت مہربانی۔ میں اپنے مسائل ہینڈل کرنا جانتی ہوں۔''

''گڈ، مجھے لڑکیوں میں بولڈنیس بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن آپ اس وقت بھی مجھ سے خوفزدہ لگ رہی ہیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' اُس نے بہت سکون سے کہا۔

''نو سر! یہ بات نہیں۔ آپ اس کیبن میں آئے ہیں، تمام اسٹاف کے لوگ مجھے عجیب نگاہوں سے چوری چوری دیکھ رہے ہیں۔ ان معنی خیز نگاہوں اور چہ میگوئیوں کی آپ کے نزدیک کوئی حقیقت نہ ہومگر سر، میں مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کے ساتھ ایسی نگاہیں، ایسی باتیں منسوب ہوجائیں تو انہیں عزت اور غیرت کے نام پر زندہ دفن کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔''

''اوکے...... اوکے۔ فکر کی کوئی بات نہیں، یہاں سب میری عادت سے واقف ہیں۔ میں ورکرز کے علاوہ واچ مین کے کیبن میں بیٹھا ہوا اکثر لوگوں کو نظر آتا ہوں۔ اینی وے، میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ باس اور ورکرز کے درمیان فاصلے زیادہ نہ ہوں تو بہتر ہے۔ ورکرز جب ہم سے اپنے پرابلمز شیئر کریں گے تو ہم ہیلپ کریں گے اور جب پرابلمز حل ہوں گی تو ورکرز اپنا کام یکسوئی اور پُرسکون انداز میں کرسکیں گے۔ اور جب کام وقت پر اور بہتر انداز میں مکمل ہوگا تو ہمیں اور ورکرز سب کو فائدہ ہوگا۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

خضریٰ خاموش رہی۔ وہ اُس کی حاضر جوابی کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ وہ بھی اسے اپنا کام دھیان سے کرنے کی تلقین کرکے چلا گیا تو گہرا سانس لے کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

✲✫✲

''بیس ہزار کے کنگن آپ کس طرح پانچ ہزار میں خرید رہے ہیں؟'' اُس نے شدید حیرانی سے دُکاندار کی طرف دیکھ کر کہا تھا جس نے نہ معلوم کس کس چیز کو کاٹ کر حساب بنایا تھا۔

''بی بی! اس رسید پر میں نے سب لکھ دیا ہے۔ سونے کی رقم آپ کو دے رہے ہیں۔''

''کیا اتنا کم سونا استعمال ہوا ہے ان میں؟ اور نگینے تو دیکھیں آپ، کتنے قیمتی اور بے حساب لگے ہوئے ہیں۔ کیا ان کی کوئی قیمت نہیں ہے؟''

''نگینوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ صرف سونے کی قیمت ہوتی ہے۔ ان دنوں تو سونے کے دام بھی گرے ہوئے ہیں۔ ان کڑوں میں سونے سے زیادہ کھوٹ ملا ہوا ہے۔''

''واہ! یہ اچھا انصاف ہے آپ لوگوں کا۔ جب ہم خریدتے ہیں تو کھوٹ، ٹانکوں، نگینوں سب کی قیمت آپ دُگنی چوگنی وصول کرتے ہیں۔ اور جب آپ خریدتے ہیں تو صرف سونے کی قیمت دے دیتے ہیں، وہ بھی چوتھائی حصہ۔'' شدید دُکھ اور غصے سے اُس کی آواز بلند ہوگئی تھی۔

''دیکھیں بی بی! اگر آپ کو انہیں فروخت کرنا ہے تو میں آپ کو صرف پانچ سو روپے بڑھا کر دے سکتا ہوں۔ اگر آپ کو سودا منظور ہے تو بولیں۔'' دُکاندار نے کاروباری انداز میں کہا۔ وہ شش وپنج میں پڑ گئی۔ کئی دُکانداروں سے معلوم کرکے یہاں آئی تھی، کوئی بھی کاروبار ماند پڑنے کے باعث خریدنے کو تیار نہ تھا۔ یہ جیولری شاپ شہر کی مشہور شاپ تھی۔ وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ یہاں ان کڑوں کی قیمت اچھی مل جائے گی۔ اب نہ معلوم اس کا وقت خراب تھا یا دُکاندار اُس کی مجبوری بھانپ گیا تھا جو سونا مٹی کے دام خرید رہا تھا۔

''بی بی! لے جائیں انہیں۔ گھر سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرکے آئیے گا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ گھنٹوں بیٹھے آپ کے فیصلے کا انتظار کریں۔ دوبارہ اگر آپ آئیں تو صرف پانچ ہزار ملیں گے، پانچ سو کی آفر ختم ہوجائے گی۔'' دُکاندار نے تند انداز میں کہتے ہوئے کنگن اُس کی طرف بڑھا دیئے اور دوسرے کسٹمر کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے بات کرتے وقت اُس کا لہجہ اتنا تند وتحقیر آمیز تھا گویا وہ کنگن فروخت کرنے نہیں، بھیک

مانگنے آئی ہے۔ اور اب اس ماڈرن لڑکی سے بات کرتے وقت اس دُکاندار کے لہجے میں اس قدر چاشنی اور احترام و ادب آ گیا تھا کہ لگتا تھا وہ شخص شیریں گفتاری و شائستگی کا پیکر ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے، مجبور کی بے بسی ہر جگہ ہی اسے بے مول کر ڈالتی ہے۔ وہ مجبور تھی۔ یہاں زیور خریدنے نہیں بیچنے آئی تھی، اس لئے بے وقعت و حقیر تھی۔ اگر اس کے پرس میں بھی نوٹوں کی ہریالی چھائی ہوتی تو وہ بھی سب کے لئے باعث احترام ہوتی۔ اس نے بالآخر فیصلہ کر ہی لیا کہ کنگن فروخت کر دے گی۔ رشتوں سے وابستگی خون کی روانی میں دوڑتی ہے، ماں دنیا سے جا کر نگاہوں سے دور ہوئی تھی، مگر دل و نگاہ کی دنیا میں ہنوز بستی تھی۔ کنگنوں سے جدائی اس کی اور ماں کی محبت میں کوئی فرق پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن پھر بھی کنگن فروخت کرتے وقت رقم ہاتھ میں لے کر اُس کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی تھی، کانپتے ہاتھوں سے رقم پرس میں رکھ کر آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کی نمی جذب کرنے کی کوشش میں وہ اِدھر اُدھر دیکھے بنا گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ جذبات کی ڈوبتی کشتی میں سوار وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ اس کے برابر میں کھڑی ماڈرن لڑکی کو ڈائمنڈ کا نیکلس دلواتے ہوئے اُس شخص کی نگاہوں نے بہت دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

✳✫✳

''آخر تم نے اپنی ماں کی آخری نشانی کو بھی جدا کر دیا۔'' انا بی نے روپے ہاتھ میں لے کر اُس کے ستے ہوئے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے رنجیدگی سے کہا۔

''امی کی آخری نشانی تو میں ہوں انا بی...... آپ اعتراض کریں گی، اس وجہ سے خاموشی سے کنگن نکال کر لے گئی تھی۔ انا بی! محبتوں کے رشتے بے جان چیزوں سے نہیں روح سے وابستہ ہوتے ہیں۔ انسان تو فانی ہے، آج مرا کل مٹی ہو گیا۔ روحیں لازوال ہوتی ہیں۔

خلوص کے روابط!

پیار و مروت کے بندھن!

محبتوں کے تعلقات!

لازوال ہوتے ہیں، روحوں کی طرح جو کبھی نہیں مرتے، ہر آن ہماری دھڑکن بن کر دل میں دھڑکتے ہیں، ہماری حیات کو بوقت ضرورت از سر نو تازگی و ولولہ، سرخوشی بخشتے ہیں۔ یہ روپے لے کر اس شخص کے منہ پر مار کر آئیں اور کہہ کر آئیں، روپے خود آپ وہاں پہنچا دیا کریں گی، اُسے یہاں آنے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔''

''اچھا دے آؤں گی۔ صبح تم آفس جاؤ گی تو میں اس کے گھر چلی جاؤں گی۔ تم منہ ہاتھ دھو لو، فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ آج میں نے ٹماٹر کی چٹنی اور مٹر پلاؤ پکایا ہے۔ تمہیں بہت پسند ہے نا؟'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح اُسے بہلانے کی سعی کی۔ وہ بھی جبراً مسکراتی ہوئی اٹھی تھی۔

دوسرے دن صبح آفس میں اُس کے لئے دھماکہ خیز خبر موجود تھی۔

''مٹھائی کھلاؤ ڈیئر! مٹھائی۔ سر نے تمہیں اپنی پرسنل سیکرٹری اپائنٹ کر لیا ہے۔ یہ رہا لیٹر تمہارا۔ آج سے تمہیں اس کیبن میں نہیں بلکہ سر کے ساتھ ان کے روم میں بیٹھنا ہے۔'' اُسے اندر آتا دیکھتے ہی ثانیہ کھڑی ہو کر پُر جوش لہجے میں بولی۔

''وہاٹ؟ کیا مقصد؟ کیا کہہ رہی ہو؟''

''سر نے ابھی بریف کیا ہے کہ آج سے تم ان کی پرسنل سیکرٹری کی سیٹ پر بیٹھو گی، ان کے سیکرٹری صاحب ورکنگ ڈیپارٹمنٹ میں شفٹ کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی سیٹ تم سنبھالو گی، واہ! اب تمہارے بھی نصیب کھل جائیں گے۔ اچھے وقت میں ہم جیسے لوگوں کو یاد رکھنا۔''

''پلیز...... پلیز ثانیہ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ اچانک ہی ہوا کیا؟ کل تک تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر اتنی......''

''اب حیرانی ختم بھی کرو یار! تم نے سنا نہیں کہ جب اللہ دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔''

''شٹ اپ، خوش ہوتے وقت تمہیں ذرا احساس نہیں کہ وہ شخص کس کیریکٹر کا مالک ہے اور تم جانتی ہو وہ بلاوجہ کسی پر مہربان نہیں ہوتا۔ میں ریزائن کر دوں گی۔ مجھ سے یہ گھٹیا اور ذلیل جاب ہرگز نہیں ہوگی۔ شرمیلا، جنیفر، روحیلہ یا مارگریٹ وغیرہ نہیں ہوں میں۔''

''میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ سر کسی کو زبردستی حاصل نہیں کرتے اور تم نے ہی تو کہا تھا کہ اگر عورت بکنا نہ چاہے تو دنیا کا کوئی بھی مرد اسے خرید نہیں سکتا۔'' ثانیہ نے اس کی بات سے ہی اسے قائل کرنا چاہا مگر وہ خاموشی سے استعفیٰ ٹائپ کرتی رہی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک دیکھ چکی تھی جس چمک کو وہ کوئی نام تو نہ دے پائی تھی مگر اس کے لاشعور میں کچھ ہونے، کسی بڑی تباہ کن گڑبڑ ہونے کا ادراک جاگ اٹھا تھا۔ وہ شخص چہرے پڑھنے کا ماہر تھا اور کل یقیناً وہ اُس کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔ جبھی بڑے اصرار سے کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی پریشانی ہے تو وہ مدد کرے گا۔ اور اس کے انکار پر اُس کے چہرے پر ناگواری و درشتگی کے سائے لمحے بھر کو چھا کر غائب ہو گئے تھے۔

''اوہ، سر کی بات سن کر میں انٹرکام آف کرنا بھول گئی۔'' انٹرکام پر نگاہ پڑتے ہی ثانیہ گھبرا کر بولی تھی۔ لیکن خضریٰ کیبن سے جا چکی تھی۔

شانزل خان نے جھٹکے سے انٹرکام کا ریسیور پٹخا تھا۔ اُس کا وجیہہ چہرہ غصے اور ضبط سے سرخ ہو رہا تھا، چند لمحے اُسے اپنی اضطرابی کیفیت پر کنٹرول کرنے میں لگے۔ اُس نے دل میں کوئی فیصلہ کیا اور اگلی ساعت وہ بالکل پُرسکون تھا۔ جنون و اشتعال انگیزی بالکل غائب ہو گئی تھی۔

''آئی ایم کم اِن سر؟'' سامنے خضریٰ نے آ کر اجازت طلب کی اور اُس کے ''یس'' کہنے پر اندر آ کر اپنا استعفیٰ اُس کے سامنے رکھ دیا۔

''ریزائن کر رہی ہیں آپ؟'' شانزل خان نے پیپر کی جانب نگاہ ڈالے بنا خضریٰ کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نارمل انداز میں کہا۔

''جی...... میں اب یہ جاب برقرار نہیں رکھ سکتی۔'' اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اوکے، ایز یو وش...... لیکن ہمارا ایک اصول ہے۔ ہم جہاں اپنے ورکرز کو بے حساب مراعات دیتے ہیں، وہاں ہم بلاسبب ریزائن کرنے والوں سے ہرجانہ بھی لیتے ہیں۔ آپ یہ رقم دے دیجئے اور شوق سے ریزائن دے جایئے۔'' اُس نے ایک سلپ آگے بڑھائی۔

''اتنی بڑی رقم، مائی گاڈ! یہ اصول نہیں، بے انصافی ہے۔ اور جاب دیتے وقت تو یہ اصول نہیں بتایا گیا تھا۔'' غصہ، رنج، تاسف اُس کی آواز اور چہرے سے عیاں تھے۔

''آپ نے اس وقت جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی ہوگی۔'' اُس کے ٹھنڈے لہجے میں طنز کی کاٹ شامل تھی۔ خضریٰ کو پورا کمرہ گھومتا ہوا لگ رہا تھا۔

''میں...... میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتی۔ کیا کوئی دوسرا اصول نہیں ہے؟''

''ہے۔ ہر ورکر کے لئے لازمی ہے کہ وہ ریزائن کرنے سے تین ماہ قبل آگاہ کرے تاکہ اتنے عرصے میں ہم نئے ورکر کو اپائنٹ کر سکیں۔ اگر آپ رقم نہیں دے سکتی ہیں تو پھر تین ماہ ویٹ کریں۔''

''لیکن میں یہاں ایک دن بھی جاب کرنا نہیں چاہتی اب۔''

''ہوں، یہاں جاب نہیں کریں گی تو آپ کو کہیں جاب کرنے نہیں دیا جائے گا اور آپ کمپنی کو ہرجانہ ادا کئے بنا گھر بھی نہیں بیٹھ سکتیں۔'' اُس کا لہجہ سپاٹ مگر اٹل تھا۔

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟''

''جو آپ سمجھیں۔''

وہ سخت تذبذب کا شکار تھی۔ جاب کی اُسے سخت ترین ضرورت تھی۔ بلاشبہ یہاں سیلری زبردست تھی لیکن ملازمت کر نہیں سکتی تھی تو چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ بہت کڑی شرط تھی، پھر دھمکی بھی۔ اور اتنا اثر و رسوخ والا بندہ واقعی اُسے کہیں جاب نہ ملنے دیتا۔ ٹھیک ہے، تین ماہ جبراً جاب کر لوں گی۔ مگر شانزل خان، تمہیں بتا دوں گی کہ میں ان گھٹیا اور حیا فروش لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں تم اپنی دولت سے زیر کرتے ہو۔

"مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟" اُس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"وہ...... میرے موڈ پر منحصر ہے۔" اُس کی نگاہوں میں فاتحانہ چمک اور ہونٹوں پر گہری تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ گویا کہہ رہا ہو اتنی جلدی شکست تسلیم کر لی۔

☆☆☆

"اللہ کی مار ان کم بختوں اور جھوٹوں پر۔ پہلے تو جھوٹ بول کر گناہ کے خوف سے لوگ مر جایا کرتے تھے، اب نابنجاروں کو چھینک تک نہیں آتی، گناہ کا تصور ذہنوں سے اس طرح مٹا ہے کہ گناہ کو گناہ سمجھتے ہی نہیں۔"

"کیا ہوا؟" اُس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر انا بی کی طرف غور سے دیکھا۔

"آج گئی تھی میں رافع فیاض کو روپے دینے۔ کہنے لگا اس طرح کام نہیں چلے گا۔ میرا سارا روپیہ تم لوگ توڑ کر دے رہے ہو، اس طرح میرا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ بس اب میرے صبر کی حد ختم ہوگئی، دو ماہ کے اندر اندر اس کی رقم اسے مل جانی چاہیے۔ ورنہ...... وہ......" معاً انا بی کو احساس ہوا کہ حضری کو سب سچ نہیں بتانا چاہیے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان و فکر مند لگ رہی تھی۔

"ورنہ کیا کرے گا وہ؟ بتائیں انا بی۔" وہ ایک دم متوحش سی کھڑی ہو گئی تھی۔

"ارے چھوڑو، وہ یونہی بکواس کرتا ہے۔ میں تمہارے لئے چائے لاؤں۔"

"نہیں۔ آپ بات پوری کریں، سچ بتائیں۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ جھوٹ بولنے والے پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔" اُس نے انہیں قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہے گا بد ذات اس کے علاوہ کہ اگر دو ماہ میں اس کی رقم پوری نہ ہوئی تو وہ تمہیں اٹھوا لے گا۔ لیکن تم گھبراؤ نہیں، اس کی جرأت نہیں ہے۔ مجھے تو فکر اس بات کی ہے کہ دو ماہ میں ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم ہم کس طرح دے سکیں گے؟"

"اُس کی کل رقم ستر ہزار ہمیں ادا کرنی ہے۔ پھر یہ لاکھ سے زیادہ کا کیا مطلب؟"

"میں نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر اُس نے مجھے رسیدیں دکھائیں تو اس میں بہت کم

روپے کی ادائیگی لکھی ہوئی تھی۔ میں خود حیران رہ گئی کہ اپنے ہاتھ سے میں ہزاروں روپیہ اسے پچھلے سال سے دے رہی ہوں۔ میں نے بہت کہا مگر وہ جھوٹا، مکار اور دغا باز ہے۔"

"اُف...... آزمائش در آزمائش کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟ میں تھک گئی ہوں انا بی! مظلوم و مجبور حالات کے بے رحم تھپیڑے کھاتی ہم جیسی لڑکیاں جن کے سر پر نہ باپ کی پناہ کی چھت ہے اور نہ بھائی کے تحفظ کا حصار، اس مردوں کے معاشرے میں رافع فیاض جیسے لالچی و فریبی، شانزل خان جیسے ہوس پرست دولت اور ناجائز اختیارات کے زعم میں خود کو خدا سمجھنے والوں سے کس طرح بچ کر نکلا جائے کہ یہ لوگ ہر قدم پر مٹی کے ذروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔" بے بسی کے احساس سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"روؤ نہیں میری بچی۔ ارے تم تو میرا سہارا ہو، میری اُمید و یقین کی روشنی۔ کوئی ماں اتنا فخر تو اپنے درجن بھر بیٹوں پر نہیں کرتی جتنا مجھے تنہا تم پر ہے۔ بیٹی! زندگی سیدھی سڑک کی مانند نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا راستہ ہے جہاں راہ میں خارزار بھی آئیں گے، کہیں فلک کو چھوتی ہوئی چوٹیاں، کہیں اندھی گہری کھائیاں اور سبزہ و خوشحالی بھی تمہاری راہ میں آئے گی۔ یہ سب شاہراہ حیات کے موڑ ہوتے ہیں۔ نا اُمیدی تو کفر ہے میری بچی۔" انا بی نے اُسے سینے سے لگایا تو اُس کے اندر بھڑکتی آگ پر یکدم ہی شبنم کی نرم نرم پھوار سی گرنے لگی۔ رگ و پے میں آسودگی اور طمانیت سکون بن کر دوڑنے لگی۔ وہ کتنی ہی دیر معصوم سی بچی کی طرح ان کے سینے سے لگی رہی۔ سچ ہے، محبت اور اپنائیت کی مٹھاس صرف خون کے رشتوں میں ہی نہیں دوڑتی، بے غرض و بے لوث محبت خون کے رشتوں پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔

ایک ہفتہ ہو چکا تھا اُسے شانزل خان کی سیکرٹری کی سیٹ پر کام کرتے ہوئے۔ ان دنوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ کام بھی ایسا کوئی خاص محنت طلب یا مشکل نہیں تھا۔ سارا دن اُس کے آفس سے ملحق شیشے کے کیبن میں بیٹھے

بیٹھے بہت معمولی سے کام کرنے پڑتے تھے۔ ثانیہ سے آتے جاتے ہیلو ہائے ہوتی تھی۔ وہ معمولات کے کام نمٹا کر فارغ ہوئی تھی کہ پی اے شازل کا پیغام لے کر آ گیا۔ وہ چادر نما دوپٹہ درست کرتی ہوئی اجازت لے کر اُس کے آفس میں آ گئی۔

''آپ نے مجھے بلایا سر؟''

''یس...... سنگا پور سے جو ڈیلیگیشن آیا ہوا ہے، ان سے ہماری بزنس ڈیلنگ ہو گئی ہے۔ اس سے ہماری کمپنیز کو کروڑوں کا پروفٹ ہوگا اور یقیناً ورکرز کو بھی۔ آج رات میں نے انہیں پارٹی دی ہے فائیو اسٹار ہوٹل میں۔ آپ کو اٹینڈ کرنا ہے یہ پارٹی میرے ساتھ۔ گھر ابھی چلی جائیں، سات بجے ڈرائیور آپ کو آپ کے گھر سے پک کرے گا۔''

''سر، میں؟'' اُس کے اوسان خطا ہوئے، خطرے کی گھنٹیاں نزدیک بجنے لگیں۔

''ہوں...... آپ۔'' دوسری طرف اطمینان و بے نیازی قابل داد تھی۔

''لیکن سر، میں...... کس...... طرح؟'' پریشانی اور خوف سے اُس کی حالت قابل رحم تھی۔ سفید لٹھے کی مانند چہرہ ہو گیا تھا۔

''کیا آپ نے کبھی کوئی پارٹی اٹینڈ نہیں کی؟'' اُس نے استفسار کیا۔

''نو سر! اس طرح کی پارٹی تو ہرگز نہیں۔''

''پھر ضرور اٹینڈ کیجئے گا۔ انسان کو ہر قسم کے ماحول اور پارٹیز کا تجربہ ہونا چاہئے۔ اور اسپیشلی ورکنگ وومنز کو۔ یہ فائل لے جائیں۔ یہ ضرور ساتھ لے کر آیئے گا۔ وہاں اس ایگریمنٹ پر سگنیچرز ہوں گے۔''

''لیکن سر...... میں......''

''آئی ڈونٹ نو، لیکن آپ کو اپنے فرائض سے پہلو تہی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جایئے اب آپ، ٹائم پر تیار رہیے گا۔'' اُس نے نہایت رُوکھے اور سخت لہجے میں اسے حکم دیا تھا۔ وہ خاموشی سے فائل اٹھا کر آفس سے نکل آئی۔ نیچے ڈرائیور اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ غالباً اُسے پہلے ہی حکم مل گیا تھا۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور اُس سے راستہ معلوم کر کے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ بڑے سر نے پک اینڈ

ڈراپ کی سہولت نہیں دی تھی مگر شازل خان نے آتے ہی ورکرز کے لئے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت مہیا کی اور کینٹینز میں کھانے کا اعلیٰ و بہترین معیار مقرر کیا بلکہ اور فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانوں کی قیمتیں کم سے کم مقرر کیں۔ اب ہر ورکر اپنی پسند کا کھانا (جو شاید گھر میں مہینوں میں نصیب ہوتا ہو) بے فکری سے کھاتا تھا۔ چائے، آئس کریم، کولڈ ڈرنکس، سب کے ریٹ بالکل مناسب تھے۔

''آج اتنی جلدی آ گئیں، خیریت تو ہے نا؟'' انا بی فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔

''ہاں، آپ پریشان مت ہوں۔'' اُس نے بیگ اور فائل ٹیبل پر رکھا، پیروں سے سینڈل اُتار کر دھپ سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اُس کے اندر اضطراب ہی اضطراب پھیلا ہوا تھا۔

''اُس نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے بہت سمجھ کر چلنا ہوگا، اس کی ہر چال کو مات دینی ہوگی، اس سے کترانا، گھبرانا تو اس کے حوصلوں کو بڑھانا ہے۔ مجھے خود کو بہادر بنانا ہے، ہاں میں بہادر ہوں، میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ شازل خان نے میری طرف میلی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش بھی کی تو میں اس کی جان لے لوں گی۔'' وہ خود کو سمجھا رہی تھی، بہلا رہی تھی کہ جب سر پر پڑی تھی تو بھگتنا تو تھا۔ ہمیشہ کی طرح اپنے دل کو سمجھا کر وہ پُرسکون ہو گئی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر سوئی تھی اور شام کو مغرب کی نماز ادا کر کے تیار ہونے لگی۔ وقت مقررہ پر ڈرائیور آ گیا۔ وہ انا بی کو اللہ حافظ کہتی ہوئی کار میں آ بیٹھی۔

''غالباً آپ بھول گئی ہیں کہ بزنس میٹنگ میں شرکت کرنے آئی ہیں۔''

''جی سر......''

''جی...... آپ کی تیاری تو ایسی ہے جیسے آپ میلاد شریف کی محفل میں شریک ہونے آئی ہوں۔'' اُس نے خاصے تنقیدی اور ناگوار لہجے میں اُس کے سادہ آسمانی کلر کے شلوار سوٹ اور چادر نما دوپٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ لمحے بھر کو وہ بری طرح سٹپٹا کر رہ گئی۔

''میڈم! لباس ہمیشہ پارٹی کے معیار کے مطابق زیب تن کیا جاتا ہے۔ خصوصاً

جہاں ایسی پارٹیز ہوں وہاں تو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہر کیف آیئے۔'' وہ گویا جبراً اُسے میٹنگ روم میں لے کر داخل ہوا تھا۔ میٹنگ کا دورانیہ پندرہ منٹ پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد بہت پُرتکلف ڈنر تھا۔ ہال رنگین روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

''سر! اب میں جاؤں گی۔'' اُس نے یہاں سے جانے میں عافیت سمجھی۔

''ہماری کمپنی کو اتنا ونڈر فل آرڈر ملا ہے، جس میں ہمیں کروڑوں کی بچت ہے۔ کیا آپ اس خوشی کو سلیبریٹ نہیں کریں گی؟'' اُس نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

''خوشیاں منانے اور شکر ادا کرنے کے سب کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں سر۔ میں ہمیشہ شکرانے کے نفل پڑھ کر اور خوشی کے آنسو بہا کر خوشیاں منانے کی عادی ہوں۔''

''اوکے، کھانا تو کھا لیجیے۔'' اُس کے لہجے میں پُرخلوص اصرار تھا۔

''نہیں سر۔ کھانا تو آج میں نے جلدی کھا لیا تھا، یہاں آنے کی وجہ سے۔ بارہ بج چکے ہیں، گھر پر انا بی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ مجھے گھر چھڑوا دیجیے۔'' نہ معلوم اُس کے دل میں کیا تھا کہ وہ چند ساعتیں ازحد گہری نگاہوں سے اُس کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا اور پھر گہرا سانس لے کر ڈرائیور کو بلا کر اُسے گھر چھوڑ آنے کا حکم دے دیا۔

''صاحب! اسٹینڈرپٹ یا ڈیفنس؟'' ڈرائیور نے آہستگی سے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''جہاں سے انہیں لے کر آئے ہو وہاں۔'' شانزل کے جواب پر ڈرائیور کے چہرے پر ازحد حیرانی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کوئی لڑکی گھر سے آ کر واپس گھر جا رہی تھی۔ ورنہ شانزل خان کے ساتھ آنے والی لڑکیوں کا ٹھکانہ شانزل خان کی مخصوص جگہوں پر ہوتا تھا۔ خضریٰ اُس کی سوچوں سے بے خبر خیریت سے گھر جانے پر اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اگر شانزل خان زبردستی پارٹی کے اختتام تک روک لیتا تو وہ مجبور ہو جاتی۔

☆☆☆

''یہ میری آخری وارننگ ہے خضریٰ جی! مجھے دو ماہ کے اندر اندر اپنی بقایا رقم مل جانی

چاہیے۔ آخر صبر اور برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں اب قطعی صبر نہیں کر سکتا۔'' رافع فیاض نے آتے ہی سخت غصے میں چیختے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''آہستہ بات کرو۔ یہاں مہذب لوگ رہتے ہیں۔ جب تمہیں کہہ دیا کہ رقم تمہیں مل جائے گی تو پھر کیوں بے صبرے ہو رہے ہو؟'' خضریٰ اُس سے زیادہ دبنگ لہجے میں بولی۔

''کچھ تو اللہ کا خوف کرو رافع میاں! ارے ہم نے تمہیں شریف آدمی جان کر تم پر بھروسہ کیا اور رقم دیتے وقت کوئی رسید اپنے پاس نہیں رکھی اور تم نے پکے بے ایمان ہونے کا ثبوت دے کر ہمیں مزید قرضے کے بوجھ سے لاد دیا۔ بہت افسوس کی بات ہے، موت کا تو خوف ہی نہیں ہے تمہیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ نہ معلوم کب سانس بند ہو جائے تو سب مال و دولت یہیں پڑا رہ جائے گا۔ ساتھ میں صرف ایمان اور اعمال جائیں گے۔'' انا بی جو برتن دھو کر فارغ ہوئی تھیں گیلے ہاتھ تولیے سے صاف کرتی ہوئی وہاں آ کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

''میری موت کی نہیں، اپنی موت کی فکر کر بڑھیا۔ مرنے کی عمر تیری ہے میری نہیں.....''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔'' خضریٰ پُرطیش انداز میں صحن میں رکھی سل کے بٹے کی طرف بڑھی تھی۔ اگر انا بی اسے تیزی سے پکڑ نہ لیتیں تو وہ یقیناً یہ سب کر گزرتی۔ رافع فیاض کی بدتمیزی نے اسے ازحد مشتعل کر ڈالا تھا۔

''کیوں اس بدذات کے خون سے اپنے ہاتھ گندے کرنا چاہتی ہو بیٹی۔ اگر اس میں ذرا سی بھی غیرت و حیا ہوتی تو یہ تمہیں اُٹھوانے کی بات ہی کیوں کرتا۔ اور نہ اس طرح ڈھٹائی سے آ کر اپنی بے ایمانی کا مظاہرہ کرتا۔'' انا بی خضریٰ کے سر پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھیں۔

''میری رقم مجھے مقررہ وقت تک نہ ملی تو پھر دیکھنا میں کیسا بندہ ہوں۔'' وہ دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ انا بی دروازہ بند کر کے آئیں تو وہ خاموش صوفے پر بیٹھی

تھی۔

''انا بی! کرائے دار سے کہہ کر کرائے کے روپے لیں، سال سے زیادہ ہونے والا ہے۔ اب میں اسے کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں۔ چلیں میرے ساتھ اوپر۔'' وہ انہیں لے کر پچھلی گلی کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ کیونکہ اوپر کے پورشن کا گیٹ پچھلی گلی میں تھا اور نیچے کے جس حصے میں وہ اور انا بی رہائش پذیر تھیں، وہ فرنٹ سائیڈ پر تھا۔ اس طرح دونوں کا آمنا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی کام ہوتا، انا بی یا کرائے دار کے بیوی بچے ایک دوسرے کے پاس آجایا کرتے تھے۔ یہ حکمت عملی انا بی کی تھی۔ وہ دونوں کسی مرد کی موجودگی کے بغیر رہ رہی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ملے۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں تو گیٹ ہاتھ لگاتے ہی پورا کھل گیا۔ گھر سناٹے کی زد میں تھا۔ وہ حیران حیران سی اندر چلی آئیں۔ گیلری، کمرے، کچن، باتھ روم سب خالی تھے۔ ہر طرف ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ نہ وہاں کوئی سامان تھا اور نہ ہی کرائے دار۔ چند لمحے شاکڈ کیفیت میں وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

''یہ لوگ کب گھر خالی کر گئے؟ اور بتا کر بھی نہیں گئے؟''

''ہائے اللہ! ایسا اندھیر، ایسا فریب اور دغا! آنکھوں میں دھول جھونک گئے۔'' خضری کو زمین آسمان گردش کرتے نظر آئے ہی تھے، انا بی کی آنکھوں میں بھی مارے پریشانی و رنج کے اندھیرا چھانے لگا۔ پندرہ مہینے کا کرایہ چڑھا ہوا تھا جس کی کل رقم بیس ہزار روپے کے لگ بھگ بنتی تھی۔

''ارے لوٹ لے گئے ہمیں، ان کا بیڑہ غرق ہو، کیسے معصوم و شریف نظر آتے تھے میاں بیوی دونوں۔ اندر سے کس قدر خبیث نکلے، کیسے خاموشی سے نکل گئے۔'' انا بی کے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

''کتنی بار میں نے آپ سے کہا انا بی کہ ان لوگوں کی باتوں کا اعتبار نہ کریں۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے کہ کسی کرائے دار سے پندرہ ماہ تک کرایہ وصول نہ کیا جائے؟''

''ہم نے تو مثال قائم کر دی نا، ہم نے ہمدردی واللہ کے خوف سے اس کی باتوں پر یقین کیا جواب بے وقوفی و پاگل پن کہلائے گی۔ اب کیا کریں؟ کہاں ڈھونڈیں انہیں؟''

''انا بی! آپ گھر میں نہیں تھیں کیا؟ جب وہ سامان لے کر گئے ہوں گے تو آواز تو آئی ہوگی۔ اور محلے سے کسی نے بھی انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا کیا؟''

''محلے والوں سے اتنے تعلقات کہاں ہیں۔ ٹھہرو میں سامنے والی سے معلوم کر کے آتی ہوں۔ اسے میں اکثر دروازے، کھڑکی سے جھانکتے دیکھتی ہوں۔ اس نے ضرور دیکھا ہوگا۔''

''پہلے منہ ہاتھ دھولیں، پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔''

''بھاڑ میں گئے منہ ہاتھ۔ میرے اندر آگ لگ رہی ہے۔ کس طرح لٹ گئے ہم لوگ۔ میں ہی بے وقوف تھی، کم عقل تھی۔ تم نے کتنا سمجھایا بیٹی کہ نہ آؤں کرائے دار کی باتوں میں۔ ساری غلطی میری تھی۔ کیوں کرائے دار کی بیوی کی باتوں میں آئی۔ کیسے جھوٹے دلاسے دیتی تھی کمبخت، مکار، آپا میری کمیٹی چل رہی ہے پچاس ہزار کی۔ آپ کے کرائے کے روپے میں کمیٹی میں بھر رہی ہوں۔ اگلے اپریل میں کمیٹی مل جائے گی تو آپ کو کرائے کی بندھی رقم ایک دم مل جائے گی۔ اور باقی رقم میں لے لوں گی۔ میرے لئے یہ اچھی بات تھی کہ بڑی رقم یکمشت مجھے مل رہی تھی۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا کہ تم نہیں مانو گی۔ کاش میں تمہیں بتا ہی دیتی تو شاید ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے یہی سوچا کہ رافع فیاض کو اتنی بڑی رقم مل جائے گی تو وہ بار بار تنگ نہیں کرے گا۔ مگر ہائے ری قسمت، جب عقل پر پتھر پڑے ہوں تو قسمت بھی سیاہ ہو جاتی ہے۔''

سامنے والی پڑوسن سے معلوم ہوا کہ وہ کرائے دار کو روزانہ تھوڑا تھوڑا سامان لے جاتے ہوئے ایک ہفتے سے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت جب وہ گھر میں نہیں ہوتی تھیں۔ دوپہر کے وقت گلی بھی سنسان رہتی تھی۔ کل دوپہر کو وہ سب ٹیکسی میں بیٹھ گئے، تب اس کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ دوسرے گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں، یہ گھر خالی کر دیا ہے۔

حقیقت جان کر انہیں بھی افسوس ہوا کہ انہیں معلوم ہوتا تو وہ انہیں قطعی جانے نہیں دیتیں۔

وہ ساری رات ان کی سوتے جاگتے پریشانی میں گزری۔ نئے کرائے دار کو گھر دینے سے وہ از حد خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ عورتیں اگر مرد کی سرپرستی میں نہ ہوں تو ہزار بھی ہوں تو تنہا کہلاتی ہیں پھر وہ تو صرف دو تھیں۔ اس وقت وہ تہی دامن، تہی دست تھیں۔ چاروں طرف سے مصائب و پریشانیوں کے عفریت منہ پھاڑے ان کی سمت دوڑ رہے تھے جن میں سب سے قریب تر عفریت رافع فیاض تھا جو اپنی تمام تر خباثتوں اور کمینگیوں کے باوجود مضبوط حیثیت رکھتا تھا۔

انا بی عمر کے اس دور میں تھیں جہاں معمولی سی پریشانی و فکر اعصاب کو تہ و بالا کر ڈالتی ہے اور ان کو لگنے والا دھچکا تو ان کے اعصابی اعتبار سے بہت زیادہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہائی بلڈ پریشر کے ساتھ انہیں بخار نے بھی جکڑ لیا تھا۔ خضریٰ اگر فوراً ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ صبح تک ان کے بخار اور بلڈ پریشر میں خاصی کمی آئی تھی۔

''لوگ اپنی خودغرضی و مفاد پرستی کے آگے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی کمینی حرکتوں کے باعث کچھ لوگ جیتے جی مر جاتے ہیں۔'' اُس نے زبردستی انا بی کو ناشتہ کراتے ہوئے سوچا۔

''تم بھی ناشتہ کرو۔ رات سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ شکر ہے آج چھٹی کا دن ہے۔ کس طرح آفس جاتیں۔ میرے سامنے بیٹھ کر ناشتہ کرو تاکہ مجھے سکون ملے۔''

ان کے سامنے بیٹھ کر ایک سلائس اُس نے چائے سے کھایا۔ دونوں کپ، کیتلی اور پلیٹیں دھو کر اُن کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟ صبر کرو، اب ہمارا فیصلہ اللہ کی عدالت میں ہوگا۔ وہ ہم سے چھپ گیا، لیکن اللہ سے کس طرح چھپے گا۔'' انہوں نے اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''کرائے دار کا معاملہ میں نے رات ہی اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور یقین جانئے ایسا کر کے میرے اندر کچھ ایسا روحانی سکون اور طمانیت اُتری ہے کہ مجھے اب ملال بھی نہیں ہو رہا۔''

''بے شک...... جب ہم اپنے رب کو دل سے محسوس کرتے ہیں تو اس کی موجودگی کا احساس اس طرح روح اور جسم کو پُرسکون و بے نیاز کر دیتا ہے۔''

''انا بی! کچھ ایسا ہے ضرور جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔ پلیز...... آپ ابھی کچھ نہیں بولیں، پہلے میری بات سنیں۔'' اُس نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''میرے آفس جانے کے بعد آپ روزانہ کہاں جاتی ہیں؟ پھر میری واپسی سے قبل آ جاتی ہیں۔''

''میں...... میں کہاں جاؤں گی بیٹی۔ اور روز روز کہاں جا سکتی ہوں؟''

''میری طرف دیکھ کر کہیں انا بی۔ آپ کی نگاہیں آپ کی آواز کا ساتھ کیوں نہیں دے رہیں؟ اور کل رات سامنے والی پڑوسن نے بھی یہی کہا تھا کہ تم دونوں کے گھر سے جانے کے بعد کرائے دار سامان لے کر جاتا رہا ہے۔ اور ہوا بھی ایسا ہی ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ وہ اوپر سے سامان لے کر گئے ہوں گے تو آپ کو آوازیں نہیں آئیں؟ کیونکہ چھت ایک ہونے کے باعث بچے کے چھوٹے چھوٹے کھلونے گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔''

''اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو مجھ سے ابھی اس سوال کا جواب مت پوچھنا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ ایک دن میں خود تم کو حقیقت بتا دوں گی۔''

٭☆٭

ایک ماہ بعد شازل خان کے تیور بدلنے لگے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ شرافت و بے نیازی کے ملبوس سے آزاد ہوتا جا رہا تھا۔ خضریٰ کا ٹھوس اور بے لچک رویہ، مضبوط کردار اس کے لئے چیلنج بن چکا تھا۔ اس کی انہی پُروقار خصوصیات نے پہلے دن ہی چونکا دیا تھا

شانزل خان کو۔ اس خاموش اور اردگرد سے بیگانہ لڑکی میں کوئی تو خاص بات تھی جو اسے یہاں سب میں منفرد ظاہر کرتی تھی۔ وہ شخص جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے، اول درجے کا کائیاں اور ذہین تھا، جس کا وقت زیادہ تر حسین رنگین لڑکیوں کے سنگ گزرتا تھا، جو جنس مخالف کو محض وقت گزاری کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ بہت سی حسین سے حسین لڑکیاں اُس کی قربت کی خواہاں تھیں اور جنہیں وہ چند دنوں یا چند گھنٹوں سے زیادہ لفٹ نہیں دیتا تھا، نہ چاہنے کے باوجود بلکہ بار بار جھٹلانے کے باوجود وہ اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا تھا جس کی کوئی بھی ادا اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اُسے یقین تھا، جس قدر وہ خود کو نیک پروین ظاہر کرتی ہے، درحقیقت وہ ایسی نیک و پردے دار نہیں ہے۔ ایسے لوگ کھوکھلے و منافق ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر مذہب پرستی کا پرچار کرتے ہیں لیکن ان کا باطن بالکل دین سے بے بہرہ و لاتعلق ہوتا ہے۔ اسی ٹائپ کی کچھ لڑکیاں اُسے دورانِ تعلیم ملی تھیں جن میں طوبیٰ سرمد کے رنگ ڈھنگ بالکل خضریٰ کی کاپی تھے اور پہلی بار وہ دل سے جس لڑکی کی عزت و توقیر کرتا تھا۔ لیکن سادگی، شرافت، معصومیت و پاکیزگی کے رنگ اتنے کچے اور پھیکے ثابت ہوئے کہ بارش کی بوندوں سے بھیگ کر اپنے بدنما و بد رنگ وجود کو ظاہر کر بیٹھے تھے۔ اُس کے دل سے پھر ہمیشہ کے لئے نسوانیت کا وقار و عزت زائل ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ آزاد، بے باک اور پردے کی قیود سے آزاد لڑکیوں کو ان لڑکیوں سے بہتر سمجھتا تھا جو جیسی تھیں ویسی ہی نظر آتی تھیں۔ کم از کم ان لڑکیوں کی طرح دوسروں کا اعتماد، فخر و اعتبار کا خون تو نہیں کرتی تھیں۔ خضریٰ حیات، طوبیٰ سرمد جیسی لڑکیوں کی نیچر سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ پہل کبھی نہیں کرے گی بلکہ اس کی پیش قدمی کو بھی جبراً ناپسند کرے گی جو محض ظاہری طور پر ہوگا اور پھر جب پردہ گرے گا تو بڑی بڑی بے باک اور ماڈرن لڑکیاں بھی متحیر سی دانتوں میں اُنگلیاں دبا کر رہ جائیں گی۔

اُس رات کو ہوٹل کے فنکشن پارٹی میں خضریٰ کو بالکل سادہ سوٹ اور بڑی سی چادر میں سر سے پاؤں تک پیک دیکھ کر اُس کا غصے سے برا حال ہوا تھا مگر وہ مصلحتاً ضبط کر گیا تھا

کہ اسے معلوم تھا ابتدا میں ایسا ہی ہوگا۔ وہ آہستہ آہستہ اصلیت پر آئے گی، پھر دوسرے دن اس نے چند سوٹ جو فیشن کے مطابق تھے، ڈرائیور کے ذریعے اُسے بھجوائے کہ وہ ایسے سوٹ پہن کر آفس آیا کرے جو اس نے ڈرائیور کو خوب سنا کر واپس کر دیئے تھے۔ لیکن وہ اس طرح کے سب ہتھکنڈوں سے واقف تھا۔ مجال ہے جو ذرا بھی شرمندہ ہوا ہو بلکہ جلد ہی وہ اُسے ساتھ ڈنر اور پھر لنچ کی دعوت دے بیٹھا جو اُس نے سہولت سے مسترد کر دی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس کا رویہ شانزل کے ساتھ خشک و ازحد سپاٹ اور رُوکھا ہو گیا۔ اُس کی جھکی نگاہوں، کشادہ پیشانی و چہرے کے دلکش نقوش سے اس کے لئے نفرت و حقارت موسلا دھار برسنے لگی تھی۔ بے تکلف تو وہ اس سے کبھی نہ تھی مگر اب اس کا حد درجہ گریز، احتیاط اور خاموشی چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ شانزل خان ایک بدقماش، آوارہ، بدکردار شخص ہے جس سے بچ کر چلنا ہر شریف زادی کا اولین فرض تھا۔ یہ سب کچھ اس کے وقار، عزت و مردانگی کے منافی تھا۔ وہ ایک لڑکی جو معمولی سی حیثیت کی حامل تھی، اُس کی ہٹ دھرمی اور رنگین مزاجی کے لئے ضد بن گئی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا جب تک اس لڑکی کو اس کے اصل مقام پر لا کر نہیں چھوڑے گا تب تک باہر کی دنیا کا ہر عیش و آرام حرام تھا اس پر۔ بھلا اس لڑکی کی کیا حیثیت تھی؟

''خضریٰ حیات! پلیز، میری ٹائی کی ناٹ تھوڑی لوز کریں۔'' اُس نے راکنگ چیئر سے سر ٹکا کر بالکل ایزی انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُس کے سامنے بیٹھی خضریٰ کا تیزی سے ڈائری پر چلتا قلم ٹھٹک کر رُک گیا۔ اُس کے اس انوکھے حکم پر اُس کی فراخ پیشانی پر ناگواری پھیل گئی تھی۔

''سوری سر! میں صرف یہاں آفس کے کام کے لئے اپائنٹ ہوں۔ اپنے پرسنلز سے مجھے دور ہی رکھیں تو بہتر ہوگا۔'' وہ کوشش کے باوجود لہجے کی تلخی دبا نہ پائی۔

''ہوں! میں اس وقت آفس میں ہی ہوں اور یہاں آپ سے جو کام لیا جائے گا وہ آفس کا کام ہی ہوگا اور آپ کو کرنا پڑے گا۔''

''میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی جو میری عزت، وقار کے منافی ہو۔''

"عزت، وقار کوڑیوں میں بکتا ہے میرے آگے۔" اُس کا لہجہ حقارت آمیز تھا۔

"آپ کا ابھی ایسی لڑکیوں سے واسطہ ہی کہاں پڑا ہے۔ آپ گھٹیا اور تھرڈ ریٹ لڑکیوں سے شریف اور با عصمت لڑکیوں کو کمپیئر نہ کریں۔" وہ اس کی کوئی بات برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔

"ریٹ تو ہر لڑکی کا ہوتا ہے، صرف ناز و ادا میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی ڈائریکٹ بانہوں میں آجاتی ہے اور کوئی اپنی قیمت بڑھانے کے لئے نام نہاد شرافت و معصومیت کا پرچار کر کے مقابل کی آتش شوق کو بھڑکا کر منہ مانگی قیمت وصول کرتی ہے۔"

"ہر لڑکی ناٹ فار سیل ہوتی ہے سر۔ علاوہ آپ کی سوسائٹی میں موو کرنے والی کچھ لڑکیوں کے۔"

"اچھا گویا آپ یہ بتانا چاہ رہی ہیں کہ آپ ناٹ فار سیل ہیں۔ لیکن......" وہ اُٹھ کر اُس کے قریب چلا آیا جو غصے اور تنفر کے باعث پہلے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ڈیئر سٹ! مجھے بھی ناٹ فار سیل چیزیں خریدنے کا زبردست ایکسپیرینس ہے۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ بلینک چیک بک ہے، یہاں جتنی چاہو رقم بھر سکتی ہو۔" اُس نے کوٹ کی جیب سے چیک بک نکال کر ٹیبل پر رکھی۔ اُس نے جھک کر بت بنی خضریٰ کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا اور دوسرے لمحے آفس کی خاموش پُرسکون فضا میں زوردار تھپڑ کی گونج ارتعاش پیدا کر گئی تھی۔ چند لمحے تک تو وہ ساکت سا رہ گیا۔ ایک معمولی سی بے اوقات لڑکی اور اس کی یہ جرأت۔ وہ غضبناک سا آگے بڑھا۔

"خبردار، جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو......" اُس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح چنگھاڑ کر کہا اور فروٹ ٹرے سے چمکدار نوک والا چاقو اٹھا کر لہرایا۔

وہ وہیں رُک گیا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اس پر ہاتھ چھوڑ دے گی۔ وہ اسے عام لڑکیوں کی طرح سمجھا تھا جو کہ اُس کی بے تحاشا دولت، ظاہری شخصیت و امارت سے مرعوب ہو کر اس کی ہوس کے جال میں پھنسنے کو دل و جان سے

تیار رہتی تھیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا نکلا تھا۔ شاید یہ لڑکی زبردست ایکٹریس تھی۔ مگر وہ بھی کوئی عام معمولی شخص نہ تھا جو ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا۔

"تم سمجھتی کیا ہو خود کو۔ کیا ہے تمہارے پاس؟ سوائے شکل و صورت کے جو ہر جگہ بہت مل جاتی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین و خوبصورت، مجھ جیسوں کے لئے منتظر، راہوں میں آنکھیں بچھائے، اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہیں۔ تم کیا چیز ہو؟" وہ حقارت سے بولا تھا۔

"ہاں، ضرور ہوں گی۔ آپ جیسے جن کا نہ کوئی کردار ہوتا ہے نہ عزت و وقار۔ جو جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر غیرت سے مرنے کی بجائے فخر سے زندہ رہتے ہیں۔ جہنمی اور بے ضمیر لوگ۔"

"دیکھ لوں گا تمہیں نیک پروین۔" وہ زخمی ناگ کی طرح بل کھاتا ہوا پھنکارا۔

"مجھے کمزور مت سمجھئے۔ جب مجھ جیسی مجبور لڑکیاں گھروں سے قدم باہر نکالتی ہیں تو اپنی کمزوری و بے بسی پہلے ہی گھر کی دہلیز میں دفن کر دیتی ہیں۔" وہ اس سے کسی طور متاثر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ یعنی شازل خان جس کی ایک نگاہ کے اشارے کی لڑکیاں منتظر رہتی تھیں آج ایک معمولی سی ورکر اُسے دھتکار رہی تھی۔ اُس کی حمیت و انا پر کاری ضربیں لگا رہی تھی۔

"سوچ لو۔ اچھی آفر کو ٹھکرا کر برائٹ فیوچر کو بلیک کر رہی ہو۔"

"میرا فیصلہ اللہ کرے گا۔ آپ کو برائٹ اور بلیک ہونے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بہت اونچا اُڑ رہی ہو، اپنی پرواز سے زیادہ بلند۔ مگر...... ایک جھٹکے میں نیچے نہ لایا تو میرا نام بھی شازل خان نہیں۔" اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر دائیں ہاتھ سے مکا مار کر غرایا۔

"مجھے معلوم تھا، بہت جلد آپ اپنی اوقات پر آ جائیں گے۔ اور میں اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ آئی انفارم یو مسٹر شازل خان، میں ابھی اسی وقت آپ کی ملازمت پر

تھوک کر جارہی ہوں۔ اور اگر آپ نے اب کوئی فضول دھمکی یا اصول بتانے کی کوشش کی تو میں مجبوراً پولیس میں رپورٹ کر دوں گی اور لوگوں کو بتادوں گی کہ آپ کس طرح سے اپنی ورکرز کی عزتوں کا سودا کرتے ہیں۔'' اُس نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا اور ٹیبل سے اپنا بیگ اٹھا کر ہمیشہ کے لئے شانزل گروپ آف انڈسٹریز کو خیر باد کہہ آئی۔ لیکن اپنے پیچھے کھڑے شانزل خان کی زہر خند مسکراہٹ نہ دیکھ پائی تھی!

☆

''کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرنا راتوں کو جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق وجنوں کی باتوں کو۔ وہ جو نہ آئے بادل چھائے، گرجے برسے، کھل بھی گئے اس کے سوا ہم ہجر کے مارے کیا جانیں برساتوں کو۔''

''اوہ شٹ۔ فضول بکواس کرنے سے بہتر ہے خاموش رہو۔'' اُس نے گھور کر شہر یار کو دیکھا جو گھٹنوں سے اُسے اِدھر اُدھر مارٹ پاسٹ کرتے ہوئے دیکھ کر شعر سنا رہا تھا۔

''غصہ تھوک دو اب۔ کب تک اپنی ٹانگوں پر ظلم کرتے رہو گے؟''

''غصہ؟ میرا دل خود کو شوٹ کرنے کو چاہ رہا ہے۔ نہ معلوم میں کس طرح اور کیوں اس احمق سی لڑکی سے تھپڑ کھا گیا اور اس کی فضول بکواس سن کر بھی اُسے جانے دیا۔''

''جب کوئی چھپ کر دل میں بیٹھ جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبت کی ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے میری جان۔ کل ہی تو میں نے ایک اسٹوری اس طرح کی پڑھی تھی۔ ہیرو بالکل تمہاری طرح ہوتا ہے ہینڈسم، خوبرو اور دولت مند ماں باپ کی اکلوتی اولاد اور اس کا کریکٹر بھی بالکل تمہاری طرح ہوتا ہے۔ پلیز...... پلیز مائنڈ مت کرو۔ تو وہ لڑکا اپنی رنگین دنیا میں مست زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ اچانک اُس کی ملاقات تمہاری سیکرٹری جیسی لڑکی سے ہوتی ہے۔ ہیرو صاحب اسے بھی عام لڑکیوں کی طرح سمجھ کر فلرٹ کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ لڑکی شریف و باحیا ہوتی ہے۔ ایک دن ہیرو صاحب کی بڑھتی گستاخی اُسے یعنی ہیروئن صاحبہ کو مشتعل کر دیتی ہے اور وہ ہیرو کے منہ پر تھپڑ دے مارتی ہے۔ اس وقت ہیرو صاحب کو ازحد غصہ آتا ہے لیکن وہ تمہاری طرح ضبط و برداشت سے کام

لیتا ہے۔ مگر جب رات کو تنہائی میں سوچتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے، سراسر غلطی اسی کی ہے۔ اس کی چھچھوری حرکت پر نیک و معصوم لڑکی کا یہی ردِعمل ہونا چاہئے تھا۔ اور جناب! اس وقت ہیرو صاحب پر یہ معاملہ کھلتا ہے کہ وہ جس لڑکی سے بیزار و بے نیاز رہتے تھے، وہ تو نہ معلوم کب سے ان کے دل کے اندر قبضہ جما کر بیٹھ گئی ہے۔ بیزاری، بے نیازی اور ضد دراصل ان کی محبتوں کا ہی انداز تھا۔ پھر تو بڑی مشکل سے ہیرو صاحب رات گزارتے ہیں اور فجر کے وقت مسجد کے بجائے ہیروئن کے گھر جاتے ہیں اور اُس کے ابا، اماں کی پرواہ کئے بغیر حالِ دل سنا ڈالتے ہیں۔ اور ہیروئن صاحبہ خود چپکے چپکے ان پر مرتی ہیں۔ وہ بھی شرما کر اعتراف کر لیتی ہے محبت کا۔ ہیروئن ہیرو کی شادی ہو جاتی ہے اور دونوں خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔''

''لیڈیز میگزین پڑھ کر تم ایسی ہی چیپ اسٹوریز پسند کر سکتے ہو۔''

''خواتین کو سمجھنے کے لئے خواتین کے رسالے پڑھنا لازمی ہوتا ہے۔''

''فی الحال تم میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو۔ اگر میں تمہیں یہ بات بتا دیتا ہوں تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ تم فضول میرا دل جلاؤ۔'' وہ بیڈ پر بیٹھ کر جھنجلا کر بولا۔

''میری بات مانو، رات بھر سوچو، ہو سکتا ہے صبح تمہیں بھی احساس......''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ گیٹ لاسٹ۔ چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' اُس نے سخت اشتعال میں اُسے زبردستی کمرے سے نکال کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا۔

''ایڈیٹ، نان سنس ہر بات مذاق سمجھتا ہے۔'' اُس نے غصے سے کہا اور ایک بار پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ یہ عمل اُس کا رات سے جاری تھا۔ خضریٰ حیات نے گویا اُسے عرش کی رفعتوں سے پاتال کی ذلت آمیز گہرائیوں میں لا پٹخا تھا۔ وہ بے جان ڈیکوریشن پیس سے جاندار جسم تک خریدنے کا عادی تھا۔ بچپن سے اب تک ہر قیمتی سے قیمتی شے اُس کے ایک اشارے پر حاضر کر دی جاتی تھی۔ پھر خضریٰ حیات جیسی بے حد معمولی لڑکی کی یہ جرأت کہ نہ صرف اُس کی پیشکش کو ٹھکرائے بلکہ اس کے چہرے پر نفرت و

حقارت کا نشان بھی ثبت کر دے۔

''نوٹ امپاسبل خضریٰ حیات! اس تھپڑ کی قیمت تمہیں اتنی مہنگی پڑے گی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔'' اُس نے وحشت جنوں میں ٹیبل پر رکھی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے خوفناک انداز میں سوچا۔

☆

''بیٹی! دروازہ بند کر لو۔ اور سنو، مجھے دیر ہو جائے گی مارکیٹ سے واپسی میں۔ پریشان مت ہونا۔ کبھی دروازے تک خوب چکر لگا کر ٹانگیں دُکھاؤ۔ طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔'' انا بی نے دروازے سے باہر جاتے جاتے بھی کوئی تیسری بار تاکید کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتی دروازے کی اندر سے کنڈی لگا کر کمرے میں آ کر پلنگ پر دراز ہو گئی۔ انا بی کو اس نے کل کا واقعہ بالکل بھی نہیں بتایا تھا۔ آج طبیعت کا خرابی کا بہانہ کر کے گھر میں تھی اور جب تک دوسری ملازمت کا بندوبست نہیں ہوتا، تب تک کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے گھر رہنا تھا۔ شانزل خان جیسے لوگ اپنی بدفطرتی، بدکرداری و عیاش طبع کو تسکین پہنچانے کے لئے حد سے گزر جاتے ہیں۔ اس قدر نیچ اور اتنے گھٹیا کہ کسی شریف کی چادر تار تار کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ سب کچھ بن مانگے مل جانے پر سجدہ شکر ادا کرنے کی بجائے خود کو خدا سمجھنے لگتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے ان جیسے بے ضمیروں کے پاس کچھ اصول، کچھ ضابطے ہوتے بھی ہیں یا نہیں، ریا و غرض سے پُر باتیں، کھوکھلے قہقہے، ہوس زدہ محبتیں جنہیں رب نے ہر طرح سے مالا مال کیا، خوب نوازا مگر جن کی نیتیں سیر نہیں ہوتیں، خواہشوں کے بے لگام گھوڑے پر سوار جو آگے اور آگے کی سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ جن کے لئے شرافت اور خباثت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ابھی نہ معلوم سوچوں کے جنگل میں کب تک بھٹکتی کہ معاً دروازے پر کسی سائل نے صدا لگائی تھی۔ اُس نے بیگ سے پانچ کا نوٹ نکالا تو کوئی چیز اُس کے ہاتھ سے ٹکرائی تھی۔ اُسے عجیب سی چبھن کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے فقیر کو پانچ روپے دے کر آئی

اور تیزی سے زپ کھول کر بیگ پلنگ پر بچھی وہائٹ چادر پر اُلٹ دیا۔ اور دوسرے لمحے اُس کے منہ سے حیرت و خوف کی ملی جلی چیخ نکلی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چادر پر پڑی ٹائی پن اور رسٹ واچ کو دیکھ رہی تھی جن میں جگمگاتے ڈائمنڈز کی قیمت کا اندازہ وہ لگا بھی نہیں سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ گھڑی اور ٹائی پن شانزل خان کی ملکیت تھیں مگر اس کے بیگ میں کس طرح آئیں؟ اس نے خود یہ چیزیں رکھی نہیں تھیں، خود سے وہ چیزیں بیگ میں آ نہیں سکتی تھیں تو پھر...... شانزل خان خود...... اور اگر اس کی یہ چال ہے تو بڑی خوفناک ہے۔

گھبراہٹ و پریشانی کے باعث اُس کے ہاتھ پیر بے جان سے ہو گئے تھے۔ ابھی وہ ڈھنگ سے سوچ بھی نہ پائی تھی کہ دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تھا۔ اس نے گھڑی اور پن اٹھا کر بیگ میں ہی ڈالے اور اسے محفوظ جگہ پر رکھ کر باہر صحن میں آ گئی جہاں دروازہ تھا۔

''کون ہے؟'' اُس نے حسب عادت دروازہ کھولنے سے پیشتر معلوم کیا۔

''میں ہوں ثانیہ۔'' دروازہ اُس نے کھولا تو وہ بہت گرمجوشی سے اس سے لپٹ گئی۔

''کہاں گم تھیں تم؟ پندرہ دن سے چھٹی پر ہو۔'' خضریٰ نے اُس کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم ان دنوں بہت بزی تھیں اس لئے بتانے کا موقع ہی نہ ملا۔ دراصل لاہور سے خالہ اور خالو آئے تھے، ساتھ خالو کے کچھ رشتے دار بھی تھے۔ ان کی مہمانداری کی خاطر چھٹیاں لینی پڑیں۔''

''بھابھی گھر پر نہیں تھیں؟ کوئی اسپیشل مہمانداری تھی کیا؟'' آخری بات اُس نے کچھ شوخی سے کہی تھی۔ دل کے اندر تو اس کے پریشانی کا طوفان تباہی مچا رہا تھا مگر اپنی پریشانی وہ کسی باہر کے بندے سے شیئر کرنے کی عادی نہ تھی۔ جبراً موڈ چینج کیا تھا۔

''میں نے تو پُرخلوص میزبانی کی تھی۔ لیکن کہتے ہیں، جو کام بے غرضی و خلوص سے کیا جائے، اس کا صلہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ میری مہمانداری انہیں اس قدر بھائی کہ وہ فوراً

اپنے بیٹے کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں ڈال گئے اور اس ماہ کی ستائیس تاریخ شادی کی فکس کر گئے۔ بھابھی میکے گئی ہوئی تھیں، اب آئی ہیں۔ خوب تیاریاں ہو رہی ہیں گھر میں۔''

''مبارک ہو، چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ آج تو تئیس تاریخ ہے۔ یعنی تمہاری شادی میں کل چار دن رہتے ہیں اور تم اب بتانے آئی ہو؟''

''پلیز، پلیز ناراض مت ہو۔ میں بتا رہی ہوں نا کہ سب بالکل اچانک ہوا ہے، کل وہ گئے ہیں، آج میں آگئی تمہارے پاس۔ یہ لو کارڈ۔ تمہیں اور انابی کو کل گھر آجانا ہے اور وہاں سے واپسی میری وداع کے بعد ہوگی اور میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

''انابی کو آنے دو مارکیٹ سے۔ پھر فیصلہ ہوگا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''سب جانتی ہوں میں، فیصلے اس گھر میں کس کے چلتے ہیں۔ تم کو ہر صورت کل سے آجانا ہے۔''

''اوکے، پہلے بتاؤ چائے پیو گی یا شربت؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''پہلے شربت پھر چائے کے ساتھ تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے گرما گرم پکوڑے۔ پہلے یہ بتاؤ تم آج آفس کیوں نہیں گئیں؟'' وہ ایک دم چونک کر بولی۔

''سر میں درد تھا رات سے۔ اس لئے چھٹی کر لی۔ کیا تم آفس گئی تھیں؟''

''ہاں۔ ریزائن کر کے آ رہی ہوں۔ میں اب لاہور چلی جاؤں گی۔''

''ایکسیپٹ کر لیا سر نے......؟'' جگ میں چینی ڈالتے ہوئے اُس کے ہاتھ رُک گئے تھے۔

''ہاں اور مجھے شادی کی مبارکباد بھی دی ہے۔''

''یعنی ایسے کوئی اصول نہیں ہیں کہ ریزائن دینے سے تین ماہ قبل فرم کو انفارم کرنا ضروری ہے، اگر فوراً ریزائن دینا ہو تو جرمانے کے طور پر لمبی رقم فرم کو دیں تو ریزائن منظور ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔''

''ارے تم سے یہ سب کس نے کہا؟ جس نے بھی کہا ہے، صرف مذاق کیا ہے۔'' ثانیہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس کر بولی تھی اور اس دن کی شانزل خان کی گفتگو اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔

''شانزل خان! تم پکے خبیث انسان ہو۔ بلکہ انسانیت پر بدنما دھبہ۔'' اُس نے نفرت سے سوچا۔

ثانیہ چلی گئی تھی۔ انابی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ تنہائی پاتے ہی اُس کے ذہن میں پھر کھلبلی مچ گئی کہ وہ گھڑی اور ٹائی پن کس طرح واپس کرے؟ ثانیہ سے ریزائن والی بات سن کر اُسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ اس نے مکاری سے دونوں چیزیں نہ معلوم کس لمحے اس کے بیگ میں ڈال دیں اور وہ محسوس بھی نہ کر پائی۔ اس کی اس طرح کی حرکت یقیناً اسے چور ثابت کرنے کی ہوگی یا پھر کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ دروازے پر دستک ہوئی تو اُس نے فوراً دروازہ کھول دیا کہ یقیناً انابی مارکیٹ سے واپس آئی ہوں گی۔ مگر سامنے شانزل خان کے ڈرائیور کو دیکھ کر اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔

''سوری میڈم! سر نے کہا ہے آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز آپ بات کر لیں۔ یہ فون نمبر ہے۔'' ڈرائیور اُس کے خطرناک تیور بھانپ کر تیزی سے موبائل اُس کے ہاتھ میں دے کر دور چلا گیا۔

''چچ...... چچ...... اتنی چیپ حرکت! چچ...... اگر روپوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہا ہوتا، وہ گھڑی اور ٹائی پن تو بہت معمولی سی قیمت کے ہیں، زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ لاکھ میں مل جائیں گے۔ بھلا اتنی معمولی سی رقم سے اس دور میں کیا ہوتا ہے ڈیئر! مجھ سے کہا ہوتا، میں کروڑوں میں تول دیتا اپنی جان کو......'' اُس کا لہجہ عامیانہ اور بہکا بہکا تھا، بھاری لہجہ خمار آلود ہو کر مزید بھاری ہو گیا تھا۔

''شٹ اپ۔ آپ کو یہ انتہائی گھٹیا حرکت بہت بھاری پڑے گی مسٹر شانزل خان۔''

''آہا...... آج محسوس ہوا میرا نام کتنا خوبصورت ہے اور کسی کے حسین ہونٹوں سے نکلنے کے بعد تو مزید حسین لگ رہا ہے۔'' دوسری طرف سے قہقہہ گونجا۔

"یہ جملے آپ اگر اپنی جیسی کسی تھرڈ کلاس گرل فرینڈ سے کہیں تو بہتر ہے۔ میرے بیگ میں خاموشی سے گھڑی اور پن رکھ کر آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے شکست دے دیں گے؟"

"شکست تو تمہیں ہو چکی ہے ڈیئر! مگر انا پسند اور ہٹ دھرم ہو، مانو گی نہیں۔ میں جانتا ہوں۔"

"وہ دونوں چیزیں ڈرائیور کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجئے گا۔"

"نو......نو ایسی غلطی مت کرنا۔ اگر ڈرائیور کے ہاتھ رسٹ واچ اور ٹائی پن بھیجا تو انجام کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔" رعونت بھرے لہجے میں دھمکی دی گئی۔

"واٹ یو مین؟" وہ غصے سے چیخی تھی۔

"آئی مین، رسٹ واچ اور پن آپ خود لے کر آؤ۔ اور......"

"میں قسم کھا چکی ہوں کہ اب کبھی آپ کی فرم میں قدم نہیں رکھوں گی۔ قسم ٹوٹنے سے بہتر میں جان دینا پسند کروں گی۔" اس نے اس کی بات قطع کر کے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، تم فرم مت آؤ۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم سے اب ملاقات آفس سے باہر ہو۔ چلی آؤ، ڈرائیور تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔ میں تمہیں خوش کر دوں گا۔ اتنی دولت دوں گا کہ......"

"میں تھوکتی ہوں تمہاری دولت پر کروڑ بار۔ سمجھے؟"

"ہم تو اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اب سوچنے اور سمجھنے کی باری تمہاری ہے۔ اگر کل تک تم میرے پاس وہ سامان لے کر نہیں آئیں تو کل شام تک میں تمہارے دروازے پر پولیس کے ہمراہ موجود ہوں گا اور فقط تم پر رسٹ واچ اور ٹائی پن کی چوری کا الزام نہ ہوگا بلکہ سوچ لو، آفس کے سیف سے لمبی چوڑی رقم کی چوری بھی تمہارے نام لگ سکتی ہے اور تمہارے گھر سے برآمد بھی ہو سکتی ہے۔ میں کس خفیہ انداز میں کام کرتا ہوں یہ تو تم سمجھ ہی گئی ہو گی۔ سوچ لو، خوب

اچھی طرح سوچ لو۔ ساری رات تمہارے پاس ہے۔ کل شام ڈرائیور آئے گا۔ اگر عزت چاہتی ہو تو خاموشی سے چلی آنا ورنہ......" دوسری طرف سے دھمکی دے کر لائن آف کر دی گئی تھی۔

دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ڈرائیور باہر نہیں تھا، وہ اُسے موبائل دے کر جا چکا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر الجھ چکی تھی کہ انا بی سے اتنی دیر سے آنے کا سبب بھی نہ پوچھ سکی۔ وہ بھی آتے ہی وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھنے لگی تھیں۔

ساری رات کی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کل ڈرائیور کے ساتھ وہ دونوں چیزیں دینے جائے گی۔ آگے کنواں، پیچھے کھائی والا حساب اس کے ساتھ تھا۔ اگر ڈرائیور کے ساتھ نہیں جاتی تو اس کا مضبوط لہجہ گواہی دے چکا تھا کہ جو اس نے کہا ہے وہ کر دکھائے گا۔ اور وہ یہ کب برداشت کرتی کہ گھر پر پولیس آ کر اسے چوری کے الزام میں گرفتار کر کے لے جائے اور اس کے ساتھ خاندانی عزت و وقار کا بھی جنازہ نکل جائے۔ جو اسے کسی طور بھی منظور نہیں تھا۔ بھلا اس کا کون یقین کرتا کہ وہ بے گناہ ہے۔

"انا بی! چل رہی ہیں نا ثانیہ کے مایوں میں؟"

"بیٹی! تم چلی جاؤ۔ میری طرف سے معذرت کر لینا۔ میں شادی والے روز آ جاؤں گی۔"

"آپ کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مان رہا۔" وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے بیٹی۔ لیکن ثواب حاصل کرنا بھی سعادت ہے۔ تم میری طرف سے بے فکر رہو اور خوشیوں میں دل سے خوش ہونا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں مسکراتے دیکھے ہوئے۔" وہ اُس کی پیشانی چومتی ہوئی شفقت سے گویا ہوئیں۔ پڑوس میں رہنے والی فاخرہ باجی کے آج کل میں پہلی ڈلیوری ہونے والی تھی۔ دو سال قبل وہ بنگلہ دیش سے اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ یہاں ان دونوں میاں بیوی کا کوئی عزیز رشتے دار

نہ تھا۔ کسی روز انا بی سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ انا بی جیسی شفیق و پُرخلوص مزاج رکھنے والی سے جو ایک بار مل جائے وہ تاحیات ان کے خلوص اور مروت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پھر تو انا بی کو وہ میاں بیوی از حد چاہنے لگے ماں کی طرح۔ کل فاخرہ باجی کے میاں کام کی وجہ سے پنجاب گئے تھے ایک ہفتے کے لئے اور انا بی کو خیال رکھنے کا کہہ گئے تھے۔ ثانیہ کی شادی کا کارڈ دیکھ کر انہوں نے کہا کہ وہ چلی جائے، وہ فاخرہ کے پاس رہیں گی کہ انہیں کسی بزرگ کی اشد ضرورت تھی۔

کشادہ شفاف سڑکوں پر کار بے آواز دوڑ رہی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر کسی مجسمے کی طرح جمی ہوئی تھی۔ تمام ہلچل، بے چینی، پریشانی و اضطراب سمندر کی ریت کی طرح تہہ در تہہ بیٹھ گئی تھی۔ ذہن اس وقت بالکل کسی سیپ کی مانند خالی تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس نے اس قدر سوچا تھا کہ اب کوئی سوچ باقی نہیں بچی تھی یا ذہن ہی مفلوج ہو گیا تھا۔

ڈرائیور نے پورچ میں کار روکی تو اس نے سر اٹھا کر سبزے کے درمیان بنے عالیشان بنگلے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ڈرائیور کے ہمراہ چلتی کئی کوریڈورز، کمرے عبور کر کے وہ ایک بے حد ڈیکوریٹڈ کمرے میں آئی تھی۔

''یہاں بیٹھیں میڈم آپ۔ سر ابھی آتے ہیں۔'' ڈرائیور نے ویلوٹ کے میرون کلر صوفے کی طرف اشارہ کر کے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ڈرائیور چلا گیا تھا۔

قیمتی فرنیچر، بیش قیمت اور خوبصورت پینٹنگز سے مزین دبیز قالین اور خوبصورت قیمتی ویلوٹ کے پردوں سے مسحور کن خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ ماحول خاصا خوابناک تھا۔ حالانکہ ابھی شام کے سائے ہر سو پھیلے ہوئے تھے مگر یہاں نصف رات گزر جانے کا گمان ہو رہا تھا۔ یکدم ہی اُس پر وحشت سی سوار ہونے لگی تھی۔ ہر طرف اتنی خاموشی تھی کہ اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گھبرا کر وہ کھڑکی کی سمت آئی۔ دھیرے سے تھوڑا سا پردہ ہٹایا تو کسی شخص کی پشت نظر آئی تھی۔ وہ کان سے موبائل لگائے کسی سے محو گفتگو تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تو باتھ گاؤن میں ملبوس وہ کوئی اور نہیں شانزل خان ہی

تھا جس کی مسکراتی فریش آواز اتنی بلند تھی کہ اس کی سماعتوں میں باآسانی پہنچ رہی تھی۔

''شٹ یار! ہم ڈال ڈال بیٹھنے والے پنچھی ہیں۔ جہاں مطلب کا دانہ پانی ملا، طبیعت سیر کی اور دوسری جانب پرواز کی۔ یہ شادی تم جیسے اسٹوپڈ لوگ کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد کس طرح ایک ہی چہرے کے ساتھ ساری زندگی گزار لیتے ہیں۔ میری زندگی میں لڑکیاں نیوز پیپر کی طرح آتی ہیں۔ جس طرح چند گھنٹے اسٹڈی کے بعد نیوز پیپر بور اور ردی ہو جاتا ہے اسی طرح......'' دوسری طرف سے نہ معلوم کیا کہا گیا تھا کہ وہ ہنسنے لگا تھا۔

''بھئی یہ عشق و محبت کی باتیں ہم جیسے لوگ نہیں جانتے۔ ہم صرف خریدنا جانتے ہیں یا توڑنا، جو پسند آ جائے اسے منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیتے ہیں اور جو ناٹ فار سیل ہوتی ہے اسے ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں ایسی حقارت و تحقیر تھی کہ خضریٰ کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اگر اس کے پاس ریوالور ہوتا تو ساری گولیاں اس کی پشت میں اتار دیتی۔ عورتوں کو کمتر اور بکاؤ مال سمجھنے کا حق اسے کس نے دیا تھا۔

''ویری ویری تھینکس، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ عورتیں کتنی نیک، پارسا، باوفا اور ساتھ نبھانے والی ہوتی ہیں یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ بہرحال جب بھی پاکستان آؤ، میرے پاس ہی ٹھہرنا۔ میری آفر ہے۔ اوکے...... مجھے اجازت دو، میری اسپیشل گیسٹ میرا لیونگ روم میں انتظار کر رہی ہے...... ہا...... ہا...... جب سب کچھ آسانی سے مل رہا ہو تو پھر مجھے تمہاری طرح اسٹوپڈ بننے کی قطعی ضروری نہیں ہے۔'' اس نے بے باک قہقہہ لگاتے ہوئے موبائل آف کیا تھا اور اسے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

خضریٰ نے جلدی سے پردہ چھوڑ دیا۔

''یا اللہ...... یا اللہ! آخر ہم جیسے لوگوں کو کیوں پیدا کرتا ہے جب ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی تو۔'' شانزل خان کا ارادہ ایک دم ہی اس پر ظاہر ہوا تو وہ وحشت زدہ سی گیٹ کی سمت بھاگی تھی اور دوسرے لمحے زمین اُسے پیروں کے نیچے سے کھسکتی

ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خبیث ڈرائیور دروازہ باہر سے لاک کر گیا تھا۔

''جانِ من!

جانِ تمنا!

جانِ بہاراں!

جانِ شانزل!

ویلکم مائی ہاؤس، ویلکم مائی ہارٹ، ویلکم مائی سویٹ ہارٹ!''

وہ خمار آلود لہجے میں بہکا بہکا اندر آ کر گنگنایا......!

وہ بہکا بہکا لڑکھڑاتا ہوا اس سے کچھ قدم کے فاصلے پر رُک گیا تھا۔

خضریٰ حیات اضطرابی طور پر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے اعصاب یکدم ہی تناؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ ایک تو اُس کا آؤٹ آف کنٹرول انداز، متضاد بیہودہ لہجہ، اس کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

''مسٹر شانزل خان! میں آپ کی ان اوچھی اور شرمناک حرکتوں کے پھندے میں نہیں پھنسنے والی۔ وہ آپ کی گھٹیا چیزیں پڑی ہیں، انہیں سینے سے لگایئے۔ میں جا رہی ہوں۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو آپ آئی ہیں۔ کچھ ہمیں خاطر مدارات کا موقع تو دیں۔ کچھ اپنی کہیں، کچھ ہماری سنیں، کیا جلدی ہے؟'' وہ صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''نو تھینکس۔ میں جانا چاہتی ہوں۔'' وہ بدستور کھڑی تھی۔

''خضریٰ حیات! کیوں وقت برباد کر رہی ہیں؟ میری آفرز ڈبل بھی ہو سکتی ہیں۔ میں آپ کو وہ سب کچھ دے سکتا ہوں جس کی چاہ ہر لڑکی کے دل میں ہوتی ہے۔ بلکہ آپ چاہیں تو میں فارن کنٹری میں سیٹل کروا سکتا ہوں۔ آپ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ پُرتعیش زندگی گزار سکتی ہیں۔ میری بات مان لیں، میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں آپ کے ساتھ۔''

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا شانزل صاحب! کہ میں تھرڈ ریٹ لڑکی نہیں ہوں اور میں اب بھی کہہ رہی ہوں، دنیا کی تمام دولت بھی مجھے نہیں خرید سکتی۔'' اُس کا

لہجہ بے خوف تھا۔

وہ چند لمحے اُس کی جانب خمار آلود نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

''جانتا ہوں..... خوب جانتا ہوں تم جیسی لڑکیوں کو۔''

''دروازہ کھولیے، میں جانا چاہتی ہوں۔''

''ہاں چلی جانا۔ میں نے کب منع کیا ہے۔ لیکن پہلے حق میزبانی تو ادا کرنے دیں۔ پلیز بیٹھیں تو سہی آپ۔'' وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتا ہوا بولا۔

''مجھے یہاں نہیں بیٹھنا۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''کیوں؟ مجھ سے خوفزدہ ہیں؟'' اُس نے بے تحاشا سرخ نگاہیں اس کے چہرے پر ڈال کر تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ شانزل کے ہر انداز سے اطمینان و برتری جھلک رہی تھی۔ جواباً اُس نے کچھ نہیں کہا لیکن چہرے سے سخت کبیدگی اور جھنجلاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ شانزل خان کی سرخ بہکی نگاہیں اُس کے رنگ بدلتے چہرے پر اس طرح مرکوز تھیں جس طرح لوہا مقناطیس سے چپک جاتا ہے۔

''کم ان یار! اسٹارٹ اٹ۔ بہت ہو گیا یہ پارسائی اور شرافت کا ڈرامہ۔ کیوں ٹائم ضائع کر رہی ہو۔ آ جاؤ۔ تمہارے تمام اخراجات میرے ذمے۔ پھر تو تم میرڈ ہو، کس بات کا خوف ہے تمہیں؟ شاید اپنے ہسبنڈ کا؟ اُسے کیا معلوم ہو گا۔ مرد تو ویسے بھی عورت کے آگے عقل و ہوش گنوا دیتے ہیں اور خصوصاً حسین ترین عورت کے ہسبنڈ تو بالکل ہی کاٹھ کے اُلو ثابت ہوتے ہیں۔ بیویاں کسی کے ساتھ بھی وقت گزاریں، وہ اس خوش فہمی میں مگن رہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کسی دوست یا ریلیٹو کے ساتھ تھیں۔'' اُس نے زہریلے قہقہے لگاتے ہوئے خاصے غیر مہذبانہ لہجے میں کہا۔

''مجھے آپ کی اس بیہودہ اور پست گفتگو پر کوئی افسوس و حیرانگی نہیں ہو رہی۔ رنج و ملال مجھے اپنے سیاہ نصیب پر ہے جو بدنصیبی مجھے آپ جیسے گرے ہوئے بے حمیت انسان کے در پر لے آئی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو اُس کے رخساروں پر بہہ

نکلے تھے۔

''چ..... چ..... ڈونٹ ویپ۔ ہم بہت زیادہ گرے ہوئے اور بے حمیت سہی مگر اب اتنے بھی گرے ہوئے نہیں کہ آپ کی حسین آنکھوں میں آنسو دیکھ سکیں۔''

''اگر آپ میں معمولی سی بھی حمیت ہے تو مجھے جانے دیں۔''

''آپ کو جانے سے کس نے روکا ہے؟ آپ جائیں گی۔ بلکہ ہم خود آپ کو عزت کے ساتھ چھوڑ کر آئیں گے۔ لیکن..... پہلے یہاں جو آتش بھڑک رہی ہے اس کو ٹھنڈا کر لیں۔'' اُس نے بائیں جانب سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہنے لگا۔

''معلوم ہے مرد کو بدفطرت اور بے حمیت کرنے والی کون ہوتی ہے؟ وہ عورت ہوتی ہے جو کبھی تمہاری طرح پردے و پاک دامنی کا ڈھونگ رچا کر ہم جیسے مردوں کو راہ سے بھٹکاتی ہے تو کبھی نام نہاد پردے کی قید سے بھی آزاد ہوتی ہے۔'' یکدم ہی وہ بپھر کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے لہجے اور آنکھوں سے آگ برسنے لگی تھی۔ ایک عجیب رنگ اس کے چہرے پر چھا گیا تھا جس میں تکلیف و درد کی کیفیت نمایاں تھی۔

''میں یہاں آپ سے بحث کرنے نہیں آئی۔''

''میری خواہش پوری کر دو۔ پھر خود چھوڑ آؤں گا۔'' وہ اس کی بات قطع کر کے بولا۔

''ہرگز نہیں۔ میں موت کو گلے لگا لوں گی مگر آپ کو ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' خضریٰ اس پر وحشی پن سوار ہوتے دیکھ کر مضبوط لہجے میں کہہ اٹھی۔

''اپنی خواہش کی تکمیل سے قبل تو میں تمہیں مرنے بھی نہ دوں گا سویٹ ہارٹ۔'' اُس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا ہی تھا کہ فضا یکلخت بے پناہ فائرنگ سے گونج اٹھی۔ بے اختیار شانزل نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اسی دم زوردار دھماکے کے ساتھ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ فائرنگ کی آواز شدید ترین ہو گئی تھی۔ شاید اندر سے بھی جوابی فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس دوہری افتاد پر وہ بالکل ہی حواس باختہ ہو گئی۔ لائٹ آف ہوتے ہی کمرہ تاریک قبر جیسا ہو گیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے

رہا تھا۔ شازل خان تو فوراً ہی لاک کھول کر وہاں سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ بھی گھبرا کر اندر سے گیٹ کی سمت بڑھی تھی۔ دو قدم چل کر ہی نہ معلوم کس شے سے ٹکرائی اور سیدھی منہ کے بل گری۔ سر کسی نوک دار چیز سے ٹکرایا تھا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ لمحے بھر میں وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہوگئی۔

نہ معلوم کتنا وقت گزرا تھا، جب اس نے آنکھیں کھولیں تو پہلا احساس یہ جاگا کہ وہ لیٹی ہوئی ہے اور بیڈ مسلسل گردش میں ہے۔ یہ احساس عجیب سا تھا۔ وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھی تھی اور اس طرح بیٹھنے سے اس کے سر کے زخم میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ لیکن اس نے اس کی پرواہ نہ کی۔ وہ جس صورت حال سے اس وقت دوچار تھی، اس نے اس کے رگ وپے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ وہ جسے بیڈ سمجھ رہی تھی، وہ بیڈ نہیں بلکہ کار کی پچھلی سیٹ تھی۔ کار مسلسل محوِ سفر تھی۔ فرنٹ سیٹ پر شازل خان کان سے موبائل لگائے کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُسے اٹھتے دیکھ کر موبائل اُس نے آف کر دیا تھا اور اس کی طرف جھک کر خاصی اپنائیت سے گویا ہوا۔

"پلیز...... آپ لیٹی رہیں۔ سر میں آپ کے خاصی چوٹ آئی ہے۔"

"یہ...... یہ آپ کہاں لے کر جا رہے ہیں مجھے؟ کیا...... کیا مقصد ہے؟" بے شک وہ بائیس سالہ زندگی میں کراچی سے باہر کبھی نہیں گئی تھی لیکن اتنا فہم وادراک رکھتی تھی کہ ہر صوبے کی ثقافت وعلاقائی جغرافیے سے واقف تھی۔ شیشوں سے باہر نظر آنے والے وہ گرم دہکتے سورج سے روشن ہوتے مناظر صوبہ سندھ کے لگ رہے تھے۔ یعنی وہ کراچی کی حدود سے باہر آ چکے تھے۔ اب نہ معلوم کس طرف جانے کا اس کا ارادہ تھا۔

"شہر کے ہنگاموں سے دور پُرسکون جگہ چل رہے ہیں ہم۔" اُس کا پُرسکون لہجہ قابل دید تھا۔ کار میں فل اے سی کولنگ کے باوجود اس کی رگ رگ میں انگارے دہکنے لگے۔ سرتاپا وہ پسینے میں شرابور ہوگئی۔ یہ احساس ہی وحشتوں میں بھٹکانے کے لئے کافی تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کی اجازت اور مرضی جیسے کوئی حیثیت ہی نہ رکھتی تھی۔

"سوچوں کے جنگلوں میں زیادہ دیر نہیں بھٹکنا چاہئے، اس طرح منزلیں گم ہو جاتی ہیں اور راستے کھو جاتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہوگی آپ کو؟ کچھ دیر رک جائیں۔" اسے خوفزدہ ومتوحش اور گم صم دیکھ کر اس نے مہربان لہجے میں تسلی دی۔ گویا اس کے لئے یہ کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔

"آخر یہ سب کیا ہے؟ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ وہ بھی میری اجازت کے بغیر۔"

"آپ کے سوال کا جواب دے چکا ہوں۔ اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو لے آیا ہوں تو واقعی میں اس جسارت پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں بقول آپ کے بہت گرا ہوا شخص ہوں، مگر اتنا گھٹیا اور بے حمیت نہیں کہ اپنے دشمنوں کے درمیان آپ کو چھوڑ آتا۔ آپ جلد ہوش میں نہ آنے کی قسم کھا کر شاید بے ہوش ہوئی تھیں کہ کوششوں کے باوجود جب ہوش میں نہیں آئیں تو مجھے مجبوراً اپنے ساتھ لانا پڑا۔ اللہ گواہ ہے، یہاں میری نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔" وہ اسی طرح اس کی طرف رخ کیے محوِ گفتگو تھا۔

"جھوٹ بول رہے ہیں۔" وہ چیخ کر بولی۔

"نہیں۔ ہم تو بہت گناہ گار بندے ہیں۔ نمائشی مسلمان۔ لیکن آپ تو پکی مسلمان ہیں۔ پانچوں وقت اللہ کو سجدہ کرتی ہیں۔ پھر اتنی صلاحیت تو آپ میں ہوگی کہ جھوٹ اور سچ میں تمیز کر سکیں کہ اللہ کو گواہ بنا کر جھوٹ تو نہیں بولا جا سکتا۔"

"اگر یہ سچ ہے تو آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ میں گھر چلی جاؤں گی۔ آپ کے دشمنوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"اب یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم کراچی کی حدود چھوڑ کر سندھ کی آخری حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور ہمارا یہ سفر کئی گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ آپ کو بے ہوشی کے دوران محسوس نہیں ہوا۔"

"اُف! لیکن مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" اُس نے

بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس لمحے شانزل خان نے کچھ برہمی کی نگاہ سے اُسے دیکھا پھر سرد لہجے میں کہنے لگا۔ ''بیوقوفی کی باتیں مت کرو، جو میں نے کہا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''بیوقوفی کی بات آپ کر رہے ہیں یا میں؟ میری اس طرح گھر سے غیر حاضری میرے لئے کیا مشکلات کھڑی کر سکتی ہے، کس طرح سے رُسوائیاں میرا آنچل داغدار کر سکتی ہیں، آپ کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ آپ کی پلاننگ میں تو یہ شامل ہے۔''

''اوہ شٹ! بدگمانی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن تم ہر انتہا عبور کر چکی ہو۔ تم سے کچھ کہنا یا سمجھانا پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا خاموش رہو تو بہتر ہے۔'' اُس نے سختی سے کہتے ہوئے رُخ پھیر لیا تھا۔

''مجھے آپ یہیں اتار دیں ورنہ میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔'' اس بار اس کے لہجے میں وحشت جنوں کچھ اس انتہا کو تھا کہ چند ساعت شانزل خان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا پھر ڈرائیور کو کار روکنے کا کہا۔ کار رُکتے ہی وہ برق رفتاری سے فرنٹ ڈور سے اتر کر بیک ڈور کھول کر اس کے برابر بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے کار دوبارہ ڈرائیو کرنا شروع کر دی۔ اُس کی برق رفتاری پر وہ بھونچکا رہ گئی۔

''تم حد درجہ بد دماغ ہی نہیں بلکہ احمق بھی ہو۔'' اس کے برابر میں بیٹھ کر وہ غرایا تھا۔ خضریٰ حیات اس کے اس طرح بیٹھنے سے غیر ارادی طور پر دور کھسک گئی تھی۔

''دور کیوں جاتی ہو، تم یہی تو چاہتی تھیں کہ میں تمہارے قریب بیٹھوں تو پھر یہ اعتراض کیوں؟'' اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے خود سے قریب کر لیا۔

''چھوڑیں مجھے۔ چھوڑو، چھوڑو مجھے۔'' اُس کے بازو کے گھیرے میں وہ تڑپ کے رہ گئی۔ اس کے مضبوط بازوں کی گرفت بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے فولادی شکنجہ۔

''بہت دیکھے ہیں ایسے ناٹک۔ بس ختم کرو نا اب۔ بہت ہو چکا۔'' اُس نے جھک کر سرگوشی کی۔ خضریٰ کے چہرے کو اُس کی سانسیں جھلسانے لگیں۔ اس کے ملبوس سے نکلتی کلون کی مہک سر چکرانے لگی۔

وہ اتنا نڈر اور بے باک تھا کہ کار میں موجود ڈرائیور کی رتی بھر بھی پرواہ نہ تھی اسے۔

''شرافت سے بیٹھ جاؤ۔ اس وقت میں ڈسٹرب ہوں۔ کوئی حماقت برداشت نہیں کروں گا۔'' ایک جھٹکے سے شانزل خان اس سے الگ ہو بیٹھا تھا اور ساتھ ہی سخت لہجے میں تنبیہ بھی کی تھی۔

باقی راستہ سکون سے طے ہوا۔ خضریٰ نے اس کی بے باک فطرت سے خائف ہو کر مزید کسی مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے دل ہی دل میں فرار کے منصوبے بنانے لگی۔ وہ بھی اسے خاموش و پُرسکون دیکھ کر اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔

شام ڈھلے کار کچے پکے راستوں سے گزر کر سرخ اینٹوں سے بنی وسیع و عریض حویلی کے گیٹ پر رُکی تھی۔ گیٹ سے باہر ہی کافی لوگ ان کے استقبال کو موجود تھے۔ سفید براق سوٹوں میں ملبوس رنگ برنگی اجرک لپیٹے، رنگین کڑھائی والی شیشوں کی ٹوپیاں اوڑھے، لمبے چوڑے لوگ جن کے بھاری بھرکم چہروں پر دور سے ہی نظر آتی سیاہ اور بے ہنگم مونچھیں خوفناک لگ رہی تھیں۔ اُس کے دل میں کسی نئے خوف نے جگہ بنائی۔

کار رکتے ہی وہ سب تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ شانزل خان بڑی گرم جوشی سے ان سے گلے مل رہا تھا۔ ڈرائیور ایک جانب مودبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ ان لمحات میں وہ جیسے منظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ پھر شانزل کو ہی اس کا خیال آیا تھا۔ اس نے قریب کھڑے ڈرائیور کو کچھ حکم دیا تھا۔ چند لمحے بعد وہ اس کی ہمراہی میں حویلی کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

☼☆☼

''کیا بات ہے بابا! کچھ اُلجھے اُلجھے پریشان سے دکھائی دے رہے ہو۔ خیر تو ہے نا سائیں؟'' رات کو کھانے سے فراغت کے بعد وجاہت علی سومرو جو اس علاقے کا وڈیرہ اور اس کا خاص دوست تھا، تنہائی ملتے ہی متجسس انداز میں استفسار کرنے لگا۔

''نہیں۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''سائیں! زیادہ اور کم کیا، پریشانی تو پریشانی ہوتی ہے اور ہمارے یار بیلی ہمارے

زندہ رہتے ہوئے پریشان ہوں یہ ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔" وجاہت سومرو نے اپنی موٹی موٹی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ناراض لہجے میں کہا۔

"تم بے فکر رہو یار! میں ایسے پرابلمز خود ہینڈل کرتا رہتا ہوں۔"

"پھر بھی کچھ معلوم تو ہو، کیا معاملہ ہے؟ تم اس طرح میرے غریب خانے پر آنے والے تو نہ تھے۔"

"خرم انڈسٹریز کے نام سے تو واقف ہو گے نا۔ پچھلے سال سے ڈیڈ کا اس سے معاملہ چل رہا ہے۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ بزنس ورلڈ میں شانزل انڈسٹریز کی ویلیوز زیرو لیول پر آ جائے۔ اپنے سب ہتھکنڈوں میں ناکام ہونے کے بعد وہ لوگ اب میرے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔ کل رات بھی اچانک ان لوگوں نے بنگلے پر اٹیک کر دیا تھا۔ ڈیڈ کی ہدایت کے مطابق مجھے ابھی چند دن اس شہر سے دور رہنا ہے سو میں تمہارے پاس چلا آیا اور کل آگے جانے کا پروگرام ہے۔" شانزل نے اُسے تفصیلاً حالات سے آگاہ کیا۔

"پہلے کیوں نہیں آگاہ کیا ان حالات سے؟ وجاہت سومرو کے دوست کا دشمن اس کا دشمن ہوتا ہے۔ بے فکر رہو، کل ہی تمہارے دشمن صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہوں گے۔ میرے بندے....."

"نہیں پلیز، تم بھی وہی کام کرنے جا رہے ہو جو ڈیڈ کرنا چاہتے تھے۔" اُس نے وجاہت سومرو کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔

"کیا تم اپنے دشمنوں کو ایسے ہی چھوڑ دینا چاہتے ہو؟"

"کم ظرف اور بزدل لوگوں کی پرچھائیوں سے بھی مجھے نفرت ہے۔ بہادر وہی ہوتے ہیں جو سامنے آ کر وار کرتے ہیں اور مقابلے کی ہمت رکھتے ہیں۔ بزدل لوگوں سے میں دشمنی یا دوستی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر یہی سب کرنا ہوتا تو میرے پاس بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اشارہ پاتے ہی جان لینے اور دینے کی ہمت و حوصلہ رکھتے ہیں۔"

"تم ابھی تک ایسے ہی ہو، درگزر سے کام لینے والے۔ ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ، رات کا کیا پروگرام ہے۔ کسی "اسپیشل گیسٹ" کا انتظام کریں یا......" وجاہت سومرو نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے مخصوص لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

"فی الحال کسی گیسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہا...... ہا...... تمہاری تھکن اتارنے کا سامان تیار کیا ہوا ہے میری جان! ڈیرے پر چلو، رنگ و سرور کی محفل سجی ہوئی ہے۔ تھرکتی قیامتیں منتظر ہیں ہماری۔"

"سرکار! وہ مہمان بہت غصے میں ہیں اور کچھ کھا پی نہیں رہی ہیں۔" اسی دم ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی۔

"اچھا تم جاؤ۔" وجاہت علی سومرو نے شانزل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ملازم کے جانے کے بعد معنی خیز لہجے میں بولا۔

"کیا چکر ہے؟ تم عورتوں کے نخرے کب سے برداشت کرنے لگے؟"

"اس بار خاصی چکر باز لڑکی ٹکرائی ہے۔ اینی وے، وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنے خول سے نکل آئے گی۔" جواباً اُس نے بھی معنی خیزی سے کہا تھا۔

"ہاں سائیں! بعض لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے فضول نخرے دکھانے کی۔ مگر زیادہ لفٹ نہ ملے تو اپنی اوقات پر جلد ہی آ جاتی ہیں۔" نہ معلوم کس جذبے کے تحت شانزل نے اسے ناگواری سے گھورا تھا۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔

"پھر چل رہے ہو نا ڈیرے پر؟"

"نہیں، تم جاؤ۔ یہ میرے عہد کا معاملہ ہے۔ جب تک میں اس بد دماغ اور گھمنڈی لڑکی کا غرور پاش پاش نہیں کر دیتا تب تک ہر رنگینی سے دور رہنے کا عہد کر چکا ہوں۔"

"پھر تو وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہو سکتی جس نے شانزل خان آفریدی کو صرف اپنا پابند کر لیا۔ یقیناً وہ ایک عالم کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

❋☆❋

"بی بی جی! اللہ کے واسطے زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی کھا لیجئے۔ کل سے آپ نے کچھ نہیں

کھایا۔ اس طرح آپ کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔" ڈرائیور نے نہایت عاجزی سے دسویں بار اس سے درخواست کی جو کمرے میں از حد خراب موڈ لئے بیٹھی تھی۔

"تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے گھٹیا انسان۔ آج تمہاری وجہ سے ہی میں یہ منحوس گھڑی دیکھنے پر مجبور ہوں۔ نہ تم دروازہ باہر سے لاک کر کے جاتے اور نہ میں اس طرح دربدر ہوتی۔ اپنے مالک کے ساتھ گناہ میں تم بھی برابر کے حصے دار ہو۔" اُس کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

"دروازہ باہر سے لاک نہیں تھا بلکہ وہ اندر سے بٹن پش کر دینے سے کھل جاتا ہے۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں، جو مالک حکم دیں اسے بجالانا ہی ہمارا فرض ہے۔"

"ایسی دلالی کی روٹی کھلانے سے بہتر ہے تم اپنے بیوی بچوں کو زہر دے کر مار دو۔ تم کیسے مسلمان ہو؟ تمہارا ضمیر کبھی ملامت نہیں کرتا اس گھٹیا نوکری پر؟"

"نور محمد!"

"جی صاحب۔" ڈرائیور شانزل خان کی آواز سن کر بوکھلا کر مڑا۔ وہ نہ معلوم کب وہاں آ کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں کی اس طرف پشت تھی۔

"جاؤ۔" اُس کا لہجہ بے تاثر اور سپاٹ تھا۔

"کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں آپ؟" ڈرائیور کے جانے کے بعد وہ اس کے قریب چلا آیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح اکڑی اکڑی کھڑی رہی۔

"میں آپ سے مخاطب ہوں۔"

"مرضی میری۔" اُس کے ہر انداز میں ہٹ دھرمی اور حقارت تھی۔ شانزل خان کا دماغ ایک دم ہی اُلٹ گیا۔ وہ کب ایسے لہجے سننے کا عادی تھا اور نہ ایسے تیور دکھانے کی کوئی اسے خواب میں بھی جرأت کر سکتا تھا۔ پھر یہ بے حیثیت، کمزوری لڑکی بار بار اس کی عزت نفس پر، اس کے پندار پر ضربیں لگا رہی تھی۔ آخر برداشت کی بھی کوئی انتہا تھی۔ وہ کبھی کسی کا رعب برداشت کرنے کا عادی ہرگز نہ تھا۔

"کیا کہا؟ پھر سے کہو۔" اُس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ شدید ترین۔

"شانزل خان آفریدی! میں نے کہا، مجھے بھوک نہیں ہے اور میری مرضی۔ مجھے اختیار ہے کہ میں جو اپنے لئے بہتر سمجھوں وہی کروں۔" وہ اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔

"نہیں، اس وقت تم میرے اختیار میں ہو اور مرضی صرف میری چلے گی، سمجھیں؟" اُس نے خضرئی کا بازو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

"ہرگز نہیں۔ تم مجھے یہاں اپنی مرضی سے لے آئے ضرور ہو، مگر اب تمہارے اختیارات کی حدود ختم ہو چکی ہیں۔"

"اختیارات!" اُس نے زہریلا قہقہہ لگایا۔ پھر اس کے شانوں پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ دیتا ہوا بولا۔ "جہاں سے میرے اختیارات کی حدود شروع ہوتی ہیں وہاں "اخلاقیات" کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔" اُس نے بے باک نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری نام نہاد پاک بازی کی بقا کے لئے لازمی ہے کہ مجھے چیلنج کر کے وحشی بننے پر مجبور مت کرو۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ مرد جب وحشی بنتا ہے تو ساری قسموں، سارے وعدوں سے نابلد و بے بہرہ ہو جاتا ہے۔" خضرئی کو لمحے بھر میں احساس دلا دیا کہ وہ ایک کمزور و ناتواں لڑکی ہے جو زبان کی کاٹ سے تو اس مرد کو زیر کر سکتی ہے مگر جسمانی لحاظ سے وہ ایک چیونٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جیسے بھرپور طاقت رکھنے والے شخص کے بازو بھی اپنے شانوں سے ہٹانے کی طاقت اس میں نہ تھی۔

"اونہہ...... مجھے گائیڈ کرنے کی کوشش مت کرنا۔" اُس نے دھکا دے کر اسے راستے سے ہٹایا تو وہ صوفے پر جا گری۔

"کھانا کھا لو...... یا میرے ہاتھ سے کھانا پسند کرو گی؟" اُس کے اشتعال بھرے انداز میں یکلخت شوخی اُبھر آئی تھی۔ اُس کے مزاج میں حد درجہ حاکمیت تھی۔ ایسے شاہانہ مزاج کے لوگ کسی دوسرے کو برداشت کرنے کا ظرف قطعی نہیں رکھتے۔ وہ چھوٹی عمر سے صرف ہاں سنتا آیا تھا۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے۔

پہلی بار خضر لی حیات نے اسے انکار کی اذیت سے روشناس کرایا تو وہ اسے اپنے لئے چیلنج سمجھ بیٹھا۔ اس وقت اس کے خود پسند جذبے کو بہت تقویت وطمانیت کا احساس ہوا جب وہ فخر و افتخار سے چلنے والی لڑکی اس کی معمولی سی قربت سے سہم کر کانپ اٹھی تھی۔ اس کے چہرے کے اُڑتے رنگ کو دیکھ کر اس کی مردانگی کا سینہ فخر وغرور سے بلند تر ہو گیا۔ انا و انتہا پسندی باغ باغ ہو گئی تھی۔

''کیا ارادہ ہے؟ کھانا ہے میرے ہاتھ سے؟'' اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ دوبارہ شوخ ہوا۔

''پلیز، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔'' اپنی ذات کی کمزوری کا احساس، لہجے کا کھوکھلا پن خود اُسے صدمے سے نڈھال کر گیا۔

''اوکے۔ فٹافٹ کھانا کھاؤ۔ کچھ دیر بعد نور محمد کو بھیج رہا ہوں برتن لینے کے لئے۔ اگر کسی چیز کی خواہش ہو تو کہو۔'' وہ دروازے کے قریب رُک کر گویا ہوا۔

''فی الوقت تنہائی، صرف تنہائی۔''

لمحہ بھر وہ اُسے بغور دیکھتا رہا پھر گڈ نائٹ کہتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اُس نے اندر سے کنڈی لگائی اور چھوٹی میز پر رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ از حد پریشانی و تفکرات کے باعث زیادہ نہیں کھایا گیا۔ پانی پی کر وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ سر کا زخم درد کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر وہ سر پر ہاتھ رکھ کر لیٹی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اضطراب زیادہ ہی بڑھا تو اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اسے یہاں سے فرار ہونا تھا اور یہ کام رات کی تاریکی میں ہی درست طریقے سے ہو سکتا تھا۔ شازل کی نگاہوں میں ہوس کا رقص وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ شخص کبھی بھی انسانیت و اخلاقیات کے لبادے سے آزاد ہو سکتا تھا اور وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کی ہوس سے داغدار ہونے سے بہتر موت کو گلے لگا لینا ہے۔

جس وقت نور محمد کھانے کے برتن لینے آیا، اس نے پلان کے مطابق بھرپور نیند سے جاگنے کی اداکاری کی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے دروازہ کھول کر جمائی لیتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

''وہ......وہ...... کھانے کے برتن لینے تھے۔'' نور محمد اس سے از حد خوفزدہ رہتا تھا۔

''صبح نہیں لینے آسکتے تھے؟ سخت نیند سے جگا دیا۔ لے جاؤ برتن۔''

''صاحب نے یہ دودھ اور ٹیبلٹ دی ہیں۔ انہیں بھی کھا لیں۔'' وہ دودھ سے بھرا جگ اور ٹیبلٹ تپائی پر رکھ کر آہستگی سے بولا اور کھانے کے برتن اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس نے ٹیبلٹ پانی سے کھائیں اور کچھ دیر بعد لیٹ گئی۔

رات کی سیاہی پوری طرح کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ تاریکی میں لپٹی ہر چیز خوفناک اور پراسرار لگ رہی تھی۔ وہ دبے دبے قدموں سے نہایت احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی۔ باہر نکلنے سے قبل اس نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ یہ حویلی گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی تھی یا دوسرے معنوں میں ان کی عیاشیوں کا اڈہ تھی۔ وہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ صرف چند ملازم تھے۔ کمرے بھی زیادہ تر لاکڈ تھے۔

ہر سو اندھیرا تھا۔ صرف راہداری میں ایک نائٹ بلب کی زرد روشنی ماحول کو مزید خاموش اور وحشت ناک بنا رہی تھی۔ گیٹ کے پاس چوکیدار چارپائی پر لیٹا بے فکری سے خراٹے لے رہا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی چوکیدار کو بغور دیکھتی رہی کہ اس کی نیند کچی تو نہیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ وہ پکی نیند سو رہا ہے تو ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے رکھی چابیوں کے گچھے کو اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ معاً ایسا محسوس ہوا جیسے اندر سے کوئی آ رہا ہو۔ وہ فوراً درخت کی آڑ میں ہو گئی اور وہاں اندھیرے میں چمکتے ننھے سے جگنو کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ایک مخصوص زاویے سے اُٹھتی گرتی سگریٹ کا شعلہ تھا جو اندھیرے میں جگنو کی مانند چمک رہا تھا۔ بغور دیکھنے پر وہ شخص بھی نہایت اطمینان سے کھڑا وہیں نظر آ گیا۔ گویا اسے یقین تھا کہ وہ یہاں ضرور آئے گی۔ سو انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

''ہیلو، مجھے معلوم تھا تم یہ احمقانہ حرکت ضرور کرو گی۔'' وہ قریب آ کر گویا ہوا۔

''آپ کو اپنے علاوہ سب احمق اور بے وقوف نظر آتے ہیں۔'' اپنی شدید ناکامی پر زبان پر قفل ڈالنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ چنانچہ جھنجلا کر طنزیہ لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ جو ہوتے ہیں صرف وہ۔" وہ بھی دل جلانے والی باتیں مزے سے کرتا تھا۔

"اونہہ......"

"یہ اونہہ اور اوں ہوں سے کام نہیں چلے گا۔ چلئے اندر، انتہائی فیصلے کرنے سے قبل تھوڑا عقل کو بھی زیر استعمال لے آیا کریں جو نہ معلوم کب سے زنگ آلود ہو رہی ہے۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا تھا۔

"تمہارے عزائم تو میں اسی وقت بھانپ گیا تھا جب تم کھانے سے انکار کر رہی تھیں۔ نور محمد نے بتایا کہ تم نارمل ہوگئی ہو بلکہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تھیں تو میرے شک کو مزید تقویت ملی۔ سوچنے کی بات ہے، ایک لڑکی جو اپنی مرضی کے بغیر لائی گئی ہو، جو کئی گھنٹے بھوکی ہونے کے باوجود کھانے کو اہمیت نہ دے رہی ہو بھلا ایسی حساس و ضدی لڑکی درپیش آنے والے اندیشوں سے بے فکر ہو کر کیسے سو سکتی ہے۔ نو......نو...... امپاسبل۔ نور محمد جیسا محدود سوچ اور ذہنیت رکھنے والا بندہ اس فریب کے جال میں پھنس سکتا ہے مگر شازل خان جو ایک دنیا کو فریب دے سکتا ہے اسے فریب دینا قطعی ناممکن ہے۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ کرسی پر بیٹھی دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس وقت غم و غصے سے اس کی بری حالت تھی۔ منزل کے قریب پہنچ کر ناکام ہو جانا اذیت ناک ترین عمل تھا۔

"بائی داوے، اس وقت آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتی تھیں؟"

"کہیں بھی۔ لیکن اس جہنم سے ہزاروں میل دور۔"

"گویا باہر تو جنت کے باسی ہاتھوں میں پھول لئے آپ کی آمد کے منتظر ہوتے۔" اس کا لہجہ سو فیصد چڑانے والا تھا اور وہ بری طرح چڑ گئی تھی۔

"بے شک۔ آپ کے مقابلے میں ان میں انسانیت و شرافت تو ہوتی۔"

"یہی تو تم میں احمقانہ پن ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "یہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جو عورت کو محض کھلونا سمجھتے ہیں۔ اور تم رات کی تاریکی میں نکل رہی تھیں۔ ایسے ویرانوں میں تنہا لڑکی کا مل جانا ایسا ہی ہے جیسے انمول ہیرا پڑا مل جائے۔ اور

سویٹ ہارٹ! بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کی پاسداری اور انا کی سرخروئی کی خاطر دریا کے قریب ہوتے ہوئے بھی باوجود پیاس کے خود کو سیراب کرنے سے باز رکھتے ہیں۔" اس کے وجیہہ چہرے پر ضبط کی سرخی چھانے لگی تھی۔

"مجھے ان واہیات ناموں سے نہ پکاریں تو مہربانی ہوگی۔"

"پھر نیک پروین یا ملانی جی کہہ کر پکاروں؟" وہ شکست کھانے والوں میں سے نہ تھا۔

"مجھے کسی بھی نام سے پکارنے کی زحمت گوارا نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اور آپ یہاں سے چلے جائیں۔" وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اوکے۔ مجھے امید ہے اب دوبارہ تم یہ غلطی دہرانے کی کوشش نہیں کروگی۔ اگر دل نہ مانے تو خود کو چودہ انجکشن لگوانے کے لئے تیار کر کے باہر نکلنے کا سوچنا۔ کیونکہ باہر اس وقت وجاہت سومرو کے شکاری کتوں کی حکومت ہے۔ پہلے میں نے منع کر دیا تھا۔" وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی اور آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز کمرے تک آ رہی تھی۔

کیا زندگی ہے میری۔ عذاب در عذاب کے بھنور میں چکراتی ہوئی۔ ایک پریشانی ختم نہیں ہوتی کہ دوسری اپنے پنجوں میں جکڑ لیتی ہے۔

مجھے بہت زیادہ چاہ تو نہیں۔ صرف عزت کی پُر وقار زندگی، طمانیت بھری تھوڑی سی خوشحالی کی ہی تو چاہ تھی۔ مجھے سوائے معبود برحق کے کسی بشر کے آگے اپنا ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جو لوگ شکر کرتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے انہیں صرف شکر ہی میسر ہوتا ہے۔ پریشانیوں میں وہ دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اور جو رب کا شکر کرنا نہیں جانتے، وہ سر سے پاؤں تک ہر لمحہ، ہر ساعت کرم نوازیوں میں بھیگے رہتے ہیں اور ایک وقت میں خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ قسمتوں میں اتنا تضاد کیوں ہوتا ہے؟ انا بی کہتی ہیں، ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اللہ جو کرتا ہے بندے کی بہتری کے لئے کرتا ہے۔ ہمیں اس سے شکوہ کرنے کا بالکل بھی حق نہیں ہے۔ ہم کون سے ان کے

حقوق و احکامات کی بجا آوری دیانت داری سے کر رہے ہیں۔ پانچ وقت سجدے کرتے ہیں تو سر سجدے میں ہوتا ہے اور من میں اپنے مسائل اور دنیا کی باتیں اُدھم مچاتی ہیں۔ خشوع و خضوع ہماری نمازوں سے غائب ہو چکا ہے۔ قرآن کو بھی ایک کتاب کی طرح پڑھا، چوما اور چمکدار جزدان میں لپیٹ کر سب سے اونچی جگہ پر رکھ دیا۔ بس یہی تعظیم ہماری نگاہوں میں ہے۔ کبھی اسے سمجھ کر پڑھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش ہم نے نہیں کی۔ ہم تو شکوہ شکایت کرنے کے بھی مجاز نہیں ٹھہرائے گئے۔

اب بھلا ہم جیسے نصیب کے مارے لوگ کہاں جائیں؟ کس سے انصاف طلب کریں؟ میں نے اپنی زندگی میں مرد کو کسی حوالے سے نہیں دیکھا تھا۔ باپ میری پیدائش سے دو ماہ قبل ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مجھے شکم مادر میں ہی یتیمی کی چادر اوڑھا کر چلے گئے تھے۔ پہلی اور آخری اولاد ہونے کے باعث مرد کے اس رشتے سے بھی سابقہ نہ پڑا جو بھائی کہلاتا ہے۔ رشتے داروں میں سوائے انا بی کے کوئی دوسرا رشتے دار نہ تھا۔ ماں کی کھوکھ میں ہی مجھ پر مصیبتوں اور پریشانیوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سائے پڑ چکے تھے۔ بچپن میرا بالکل اسی مفلسی میں گزرا جیسا ایک غریب و یتیم بچی کا گزرتا ہے۔ امی اور انا بی کو رات دن مشین پر جھکا دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑ چکی تھی کہ پڑھ لکھ کر مجھے اچھی سی جاب کرنا ہے اور ان دونوں کے تمام دکھ درد سمیٹ لینا ہے۔ میں کبھی عام بچوں کی طرح گلیوں میں نہیں کھیلی اور نہ ہی میری کوئی سہیلی تھی۔

میری دوستی کورس کی کتابوں سے تھی اور اس دوستی نے ہر کلاس میں مجھے ٹاپ پوزیشن دلوائی تھی۔ میٹرک کے بعد جب میں نے کالج میں فرسٹ ایئر میں ایڈمشن لیا تو ساتھ ہی گھر میں ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔ اس طرح خرچے کا بندوبست ہو گیا تھا۔

امی کی طبیعت بھی اب کافی دنوں سے درست نہیں رہتی تھی۔ بخار اور کھانسی کی شکایت اکثر رہنے لگی تھی۔ پھر جب خواب کی تعبیر ملنے کے دن آئے تو امی نے اپنا فیصلہ سنا کر ایک ہی ضرب سے سارے خواب چکنا چور کر ڈالے۔ وہ ماضی میں کھو گئی......!

''شادی؟ لیکن امی، میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے گریجویشن اس لئے

نہیں کیا کہ ہاتھ پیلے کر کے آپ کو بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں۔ ابھی میرے بہت سے خواب ادھورے ہیں۔ مجھے بیٹا بن کر آپ کی خدمت کرنی ہے، آپ کا بوجھ اٹھانا ہے۔ آپ نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں میری خاطر۔ اب مجھے خدمت کرنی ہے آپ کی اور انا بی کی۔ میں نے دو جگہ اپلائی کیا ہے ملازمت کے لئے۔ آج کل میں جواب آ جائے گا۔''

''ہمیں تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں ہے بیٹی! صرف اللہ کا سہارا درکار ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیوں سے نوکری کروانے کا رواج نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں اس خیال سے تعلیم دلوائی ہے کہ تمہاری کمائی پر ہم گزارہ کریں گے۔'' امی کے نرم لہجے میں بھی ترشی شامل تھی۔

''امی! یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ کیا آپ دونوں نے گھر بیٹھ کر محنت نہیں کی؟''

''گھر بیٹھ کر محنت کرنے اور باہر نکل کر کام کرنے میں بہت فرق ہے بیٹی۔ یہ وقت بہت خراب ہے، اس دور میں بہن، بیٹی جیسے معتبر و پاکیزہ رشتے کم ظرف لوگوں کی گندی ذہنیت سے اپنا مقام کھو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتی میری بیٹی کسی کی گندی نگاہوں کا نشانہ بنے۔ میری آرزو یہی ہے کہ تم عزت و آبرو سے ہماری دعاؤں کے سنگ اپنے اصل گھر سدھارو۔''

''لیکن امی! میں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔'' اس کی فطری ضد عود کر آئی۔ بھلا اس دن کے لئے اس نے تعلیمی میدان میں سخت ترین جدوجہد کی تھی کہ جب کچھ کر دکھانے کا موقع آئے تو وہ عام لڑکیوں کی طرح گھونگھٹ میں منہ چھپائے ایک انجان شخص کے ہمراہ ان دونوں کو بے آسرا چھوڑ کر چلی جائے اور اپنی زندگی میں مست ہو جائے۔ وہ اتنی خود غرض و موقع پرست نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد انہیں صرف اور صرف خوشحال زندگی دینا تھا۔ خود کو مٹا کر انہیں خوشیاں اور سکھ دینا تھا۔

ان دونوں کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ اپنے انکار پر قائم رہی تو امی نے اپنی بات منوانے کے لئے بھوک ہڑتال کر دی۔

گھر میں ویرانی و اُداسی بال بکھرائے گھومتی تھی۔ انا بی ان دونوں ماں بیٹی کو سمجھانے میں ہر طور ناکام رہی تھیں۔ پورا ایک دن گزر گیا تھا۔ امی نے پانی تک نہ پیا تھا۔ بخار کی شدت نے انہیں پھر آن گھیرا تھا اور کھانسی نے ایک ایک جوڑ ہلا ڈالا تھا۔

''امی! ناراضگی مجھ سے ہے۔ پھر آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں؟ انا بی بھی کل سے کچھ کھا پی نہیں رہی ہیں۔ اور دیکھیں آپ کو بخار کتنا ہو رہا ہے اور کھانسی تو بار بار آ رہی ہے۔ پلیز آپ کچھ کھا لیں تاکہ دوائی کھائی جا سکے ورنہ طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔'' اس سے آخرکار ان کی حالت نہ دیکھی گئی تو وہ ان کے قریب بیٹھ کر گلوگیر لہجے میں بولی۔

''اچھا ہے، طبیعت زیادہ خراب ہو گی تو اس زندگی کی قید سے آزاد ہو جاؤں گی۔''

''امی! اللہ نہ کرے۔ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''کرتی رہنا میرے بعد اپنی من مانیاں۔ تمہیں میری فکر کیا ہے؟ کہاں خیال ہے ماں کی حالت کا۔ کتنی خوش تھی میں کہ اپنی زندگی میں بیٹی کو وداع کروں گی۔ مگر بیٹی اتنی خودسر اور ضدی ہو گی جو صرف اپنی چلانا جانتی ہو گی اس کا تو مجھے احساس ہی نہ تھا۔ ہاں جاؤ کرو اپنی خوشی پوری۔ ماں کی خواہش اور فرض سے تمہیں کیا غرض۔''

''امی، امی۔'' وہ بری طرح رو دی ان کی بدگمانی پر۔ لیکن ان کا دل نہ پگھلا۔

''مجھے سمجھنے کی کوشش کریں امی! مجھے غلط مت سمجھیں۔''

''خاموش رہو۔ سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر گیا۔ میں بھی پاگل......'' اس بار کھانسی کا اتنا شدید دورہ پڑا تھا کہ انہیں سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

''فاخرہ! دو گھونٹ پانی پی لو۔ حلق بالکل خشک ہو گیا ہے۔'' انا بی اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ان سے منت بھرے لہجے میں بولیں۔

''نہیں انا بی! میں نے قسم کھائی ہے۔ جب تک یہ میرا کہنا نہ مانے گی میرے لئے ایک گھونٹ پانی پینا بھی حرام ہے۔'' وہ تکلیف سے بے حال اٹل لہجے میں بولیں۔

''کیوں بچوں کی طرح ضد کر رہی ہو فاخرہ! بچی کے ساتھ بچی بن رہی ہو۔ مان

جائے گی۔ اسے سوچنے سمجھنے کے لئے کچھ وقت دو۔ یہ تمہارا خون ہے۔ بھلا تمہارے فیصلے سے انحراف کا حوصلہ کر سکتی ہے؟'' انا بی انہیں سمجھاتے ہوئے خود بھی رو پڑی تھیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

''سب جتن کرنے کے بعد بھی آپ اس کے حوصلے کی بات کر رہی ہیں انا بی۔ حیرت ہے، اسے میری نہیں اپنی پرواہ ہے۔ ماں کا فیصلہ اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں ماں نہیں دشمن ہوں اس کی۔ اس کے لئے برا چاہوں گی نا۔ مر جانے دو مجھے۔''

''امی...... امی! آپ ایسا نہ کہیں۔ مجھے آپ کی بات منظور ہے آپ کے ہر فیصلے پر میں جان لٹانے کو تیار ہوں۔ آپ جو کہیں گی میں کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ روتی ہوئی ان سے لپٹ گئی تو انہوں نے بھی روتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

''میں کہتی ہوں لڑکے کی عمر کافی ہے۔ ہماری خضریٰ کے ساتھ اس کا جوڑ صحیح نہ رہے گا۔'' وہ شام کی چائے بنا رہی تھی جب انا بی کی دبی دبی آواز صحن سے سنائی دی۔

''آپ نے بھی اتنی عمر کہاں گنوائی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے، بڑی عمر کے مرد نوجوان و حسین بیوی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اور جوڑ والے مرد تو الٹا بیویوں کو کنیز بنا کر رکھتے ہیں۔ رات دن خدمت کرتی ہیں لڑکیاں تب بھی وہ توجہ و محبت نہیں پاتیں جو ایسے مرد دیتے ہیں۔ دیکھنا رافع فیاض خضریٰ کو رانی بنا کر رکھے گا۔ میری بچی وہاں ہر وہ سکھ دیکھے گی جو ہم بدنصیب اسے نہ دے سکے۔'' فاخرہ کے لہجے میں گزری محرومیوں کے عکس میں آنے والے سنہری مستقبل کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

چائے مگوں میں نکالتے وقت اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس کے اور امی کے جذبے میں ایک قدر مشترک تھی کہ اگر وہ ان کے بہتر دنوں کی خواہش رکھتی تھی تو وہ بھی اس کے بہترین مستقبل کے لئے کوشاں تھیں۔

''اچھی طرح معلومات تو تم نے حاصل کر لی ہیں نا رافع فیاض کے بارے میں؟'' انا بی کسی طور مطمئن دکھائی نہ دے رہی تھیں۔

''ہاں...... ہاں۔ حاجی صاحب کا دیکھا بھالا ہے۔ انہوں نے ضمانت دی ہے۔ بے

چارے کا کوئی نہیں ہے اس لئے تھوڑی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ کاروبار بھی اپنا ذاتی ہے۔ اسکریپ کا خاصا بڑا کاروبار ہے۔ اس کی نیت کا یہیں سے اندازہ لگا لو کہ جہیز کے نام پر کچھ لینے کو تیار نہیں بلکہ میں نے کہا بھی کہ میں جلد شادی نہیں کر سکتی اپنی بیٹی کی تو بڑی چاہت واپنائیت سے بولا۔ ماں جی! جہیز کے نام پر میں پھوٹی کوڑی لینے کا بھی روادار نہیں ہوں۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے، آپ کی بیٹی کے نصیب کا ہی ہے۔ آپ تو صرف اس چاند کو میرے آنگن میں اتار دیں۔ میری زندگی میں اجالا ہی اجالا بکھر جائے گا۔ نہ معلوم کب اس نے خضریٰ کو دیکھا اور حاجی صاحب سے خواہش کر بیٹھا۔

وضع دار اور باوقار ماں کے منہ سے نکلنے والے آخری جملے نے اس کو پژمردہ کر ڈالا تھا۔ تنہا و بے سہارا ہونے کے خیال نے شاید ان کی سوچوں کو مجروح کیا تھا جو وہ اس انداز میں سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ رافع فیاض کو بہت جلدی تھی اور فاخرہ کو اس سے بھی زیادہ۔ سو منگنی کا جھنجٹ ہی نہ رکھا گیا، سیدھے سبھاؤ شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

رافع فیاض کے انکار کے باوجود فاخرہ اور انا بی حسب استطاعت اس کے لئے جہیز تیار کر رہی تھیں۔ وہ اس دوران خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ آخر کار وہ دن بھی آ ہی گیا کہ اسے پیلے جوڑے میں کرن لگا دوپٹہ اوڑھا کر مایوں کی رسم ادا کر دی گئی۔ چند ہمسائیوں کے علاوہ حاجی صاحب اور ان کی بیوی نے بھی شرکت کی تھی۔ حاجی صاحب اور ان کی بیوی اس وقت وی آئی پیز کی حیثیت کے حامل تھے۔

رافع فیاض کی جانب سے وہ اگر اس کے بزرگ بنے ہوئے تھے تو یہاں بھی خضریٰ حیات کے بڑوں کا حق وہی ادا کر رہے تھے۔ دونوں جانب ان کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ اپنی بساط سے بڑھ کر انہوں نے اس کے لئے جہیز بنایا تھا۔

زیورات میں طلائی چوڑیاں، کنگن اور خوبصورت کانوں کی بالیاں تھیں جو امی نے اس کے شوق کے پیش نظر ایک عرصے سے روپیہ جوڑ جوڑ کر بنوائی تھیں اور شادی والے دن خود اپنے ہاتھوں سے اس کی مرمریں کلائیوں میں پہنا کر کتنی دیر اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے لگا کر روتی رہی تھیں۔ بارات میں بہت مختصر لوگ آئے تھے۔ نکاح

سے قبل نہ معلوم کس نے یہ شوشا چھوڑا کہ پہلے یہ گھر دولہا کے نام کیا جائے پھر نکاح ہو گا۔

ان دونوں کے حواس گم ہو گئے تھے۔ انہیں یہ امید نہ تھی کہ بارات دہلیز پر لانے کے بعد وہ یہ مطالبہ کریں گے۔ صلاح و مشورے کے بعد وہ یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ مکان وہ رافع فیاض کے نام کر دیں گی لیکن خضریٰ نے دھمکی دے دی کہ اگر مکان اس کے یا رافع فیاض کے نام کیا گیا تو وہ نکاح کرنے سے انکار کر دے گی اور یہ بات جب رافع فیاض کے کانوں تک پہنچی تو وہ صاف مکر گیا کہ اس کی طرف سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔

نکاح کے بعد کھانے کا پروگرام تھا کیونکہ بارات میں گنتی کے لوگ شامل تھے۔ فاخرہ نے کھانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ وداع ہو کر وہ رافع فیاض کے فلیٹ میں آ گئی۔ یہاں اس کا سواگت کرنے کے لئے کوئی نہیں تھا۔ حاجی صاحب کی بیوی اسے سجے ہوئے بیڈ روم تک چھوڑ کر گئی تھیں۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، کمرہ روایتی انداز میں پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ فرنیچر اور دوسرا سامان سب کا سب اس کے جہیز کا ہی تھا۔

باہر قدموں کی آواز ابھری تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ آج اُس کی زندگی کی یہ اہم اور انوکھی رات تھی جس کا تصور ہی نہایت حسین و کیف آور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہ ابھری تھی جس سے جذبوں میں ہلچل مچتی۔ ہلچل مچنے کے لئے جذبوں کی صداقت بڑی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں نہ کوئی خواہش تھی اور نہ ہی جذبات۔ ماں کی خاطر وہ اپنی خواہشات کا قتل کر کے رافع فیاض کے ساتھ آئی تھی۔ یہاں تک آتے آتے اس کی خواہش اور آرزوئیں جل کر خاک ہو چکی تھیں۔ جہاں پر خواہشیں مر جائیں، وہاں سمجھوتے زندہ رہ جاتے ہیں۔ رافع فیاض کے ساتھ وہ سمجھوتہ کرنے آئی تھی۔ ماں کو خوش رکھنے کی خاطر سب کچھ منظور تھا۔

کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا تھا۔ اُس نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک درمیانی عمر کی فیشن ایبل عورت کے ہمراہ دوسری بڑی عمر کی بڑھیا خطرناک تیور لئے اندر داخل ہو رہی

تھیں۔ ان دونوں کے چہروں میں اتنی مشابہت تھی کہ بغیر جانے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ ان کے انداز اتنے خطرناک ارادے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اسی پل دو صحت مند مرد ایک بانس کی طرح لمبے سوکھے، گہری سانولی رنگت کے مرد کو گریبان سے پکڑ کر وہاں لے آئے اور فالتو سامان کی طرح فرش پر پٹخ دیا۔ آف وہائٹ پائجامے اور شیروانی میں ملبوس اس شخص کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ وہی رافع فیاض ہے۔ اس کا شوہر نامدار لیکن اس حالت میں؟

”کیوں بھئی، تم نے ہمیں بالکل ہی احمق سمجھ لیا تھا؟“ وہ بڑھیا آگے بڑھ کر غصے سے فرش پر پڑے رافع سے مخاطب ہوئی۔

”ایک بیوی تو تم سے سنبھالی نہیں جاتی اور اب دوسری لے آئے ہو۔“ وہ عورت گم صم کھڑی خضریٰ کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہوئی بولی۔

”تمہیں کیا نظر آیا تھا اس لنگور جیسی شکل والے میں؟ ہاں شاید تم سوچ رہی ہو گی مالدار آدمی ہے، اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر سب کچھ لوٹ کر لے جاؤ گی۔“ بڑھیا جو شکل سے ہی لڑاکا دکھائی دے رہی تھی اس کی جانب بڑھتے ہوئے غصے سے بولی۔

”اس کا حسن تو میں ابھی برباد کر کے چڑیل بنا دوں گی۔ اس نے میرے حق پر ڈاکا ڈالنے کی جرأت کی ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گی۔“ دوسری عورت زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اس کے لہجے سے حد درجہ سفاکی و درندگی جھلک رہی تھی۔

”صبر کرو رخسانہ! پہلے اس مردود سے نمٹ لیں پھر اس چھوکری کو بھی زندہ دفن کر دیں گے۔“ وہ دونوں ہٹے کٹے آدمی خضریٰ کو گھورتے ہوئے گرج کر بولے۔ ان کی لاتیں بڑی بے دردی سے رافع فیاض کے جسم پر پڑ رہی تھیں اور اس کے منہ سے نکلنے والی کراہوں سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مارے جا رہے تھے۔

”ہم ایک ہفتے کے لئے شہر سے باہر کیا گئے تو نے ہماری بہن پر سوکن لا کر بٹھا دی۔ تجھے ہم نے عزت والی زندگی دی اور تو نے یہ صلہ دیا ہے احسان فراموش۔“

رخسانہ کا بڑا بھائی تو غم و غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

”تجھے تو میں مٹی کا تیل ڈال کر جلا کر ماروں گی۔ تو میری جگہ کس طرح لے سکتی ہے کتیا؟“ رخسانہ نے غصے سے بھڑکتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے نوچنا چاہا مگر خضریٰ اس کا ارادہ بھانپ کر دور ہٹ کر سخت لہجے میں بولی۔

”پہلے میری بات سنو، یہ شخص جھوٹا ہے مکار ہے۔ اس نے خود کو لاوارث اور غیر شادی شدہ ظاہر کر کے شادی کی ہے۔ اگر پہلے معلوم ہو جاتی یہ حقیقت تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔ مگر بے فکر رہو، میں نہ تمہاری جگہ لینے آئی ہوں اور نہ تمہارا حق چھیننے۔ رافع فیاض تمہارے تھے اور تمہارے ہی رہیں گے۔ میں تمہارے درمیان سے نکل رہی ہوں۔“ اس نے ٹھہرے ٹھہرے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ چاروں لمحے بھر کو دم بخود رہ گئے۔

”شاید آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا، اس سے زیادہ میں آپ کو سمجھانے سے قاصر ہوں۔ مگر یہ فیصلہ اٹل ہے کہ میں اب اس شخص کے ساتھ کبھی نہیں رہ سکتی۔“

”اگر تو اتنی ہی سچی اور وعدے کی پابند ہے تو یہ سب زیور ہمیں اتار کر دے۔ اور سن، تجھے رافع سے طلاق لینی ہو گی اور تجھے کوئی سامان واپس نہیں ملے گا۔“ رخسانہ اس کے قریب آ کر شرطیہ انداز میں کہنے لگی۔ اس کی باتوں کی تائید ان تینوں نے بھی کی، جبکہ رافع فیاض ظالمانہ مار سے بے ہوش پڑا تھا۔

”منظور ہے مجھے۔“ اُس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً جواب دیا۔

”چل جا۔ طلاق تو تجھے ابھی مل جاتی لیکن یہ منحوس آدمی اس حالت میں نہیں ہے۔ کل پرسوں تجھے طلاق کے کاغذات مل جائیں گے۔“ رخسانہ نے زیورات سمیٹتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا اور فرش پر پڑے ہوش و خرد سے بیگانہ رافع فیاض پر نفرت انگیز نگاہیں ڈال کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔

⁕☆⁕

”ہم تو جیتے جی مر گئے حاجی صاحب! جب آپ کو اس کے بارے میں معلوم نہ تھا تو کیوں ضامن بنے تھے؟ کیوں اس کی باتوں میں آ کر آپ نے میری پھول سی بچی کے

نصیب پر سیاہی پھیلا دی؟ ہم نے آپ پر اعتبار کیا، اپنا بزرگ سمجھا، لیکن یہی قصور تھا ہمارا؟'' فاخرہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے ان سے شکوہ کیا۔

''اس میں تمہاری بیٹی کے نصیب کا دوش ہے۔ ہمیں قصوروار کیوں ٹھہراتی ہو بی بی! میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی نہ پڑیں ان چکروں میں۔ آج کل لوگ ہیں ہی احسان فراموش اور مطلب پرست۔ کل ہم سے اچھا کوئی نہ تھا آج ہم میں کیڑے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اچھا ہوا تو اللہ نے کیا اور برا ہوا تو بندے بدنام ہوتے ہیں۔ ارے ہمیں بخشو بی بی! آئندہ ہم سے کوئی تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جانو، تمہاری بیٹی جانے۔ ہم نے تو سب نیک نیتی سے کیا تھا۔ برائی تو تمہاری بیٹی کے نصیب میں لکھی تھی۔'' حاجی صاحب کی بیگم جو ہر معاملے میں پیش پیش تھیں، اب حقیقت حال عیاں ہونے پر کوئی الزام اپنے سر لینے کو تیار نہ تھیں، الٹا انہیں ہی موردِ الزام ٹھہرا کر بڑبڑاتی ہوئی حاجی صاحب کے ساتھ وہاں سے چلی گئیں۔

''کوئی نہیں ہے، میں خود ذمے دار ہوں اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے کی۔ اس نے تو کتنا انکار کیا، ہر دلیل سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میری عقل پر ہی پتھر پڑ گئے تھے جو اس کی ایک نہ مانی۔'' فاخرہ خود کو کوستے ہوئے رونے لگیں۔

''امی! کب تک خود کو الزام دیتی رہیں گی۔ یہ میری سیاہ بختی ہے جو اس وقت سے میرا پیچھا کر رہی ہے جب میں نے اس دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔'' وہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔

''بہت ہمت والی ہے میری بیٹی۔ ایسا صدمہ کس خاموشی سے برداشت کر رہی ہے۔'' انہوں نے شفقت سے اسے لپٹا لیا۔

''آداب عرض ہے جی!'' آواز تھی کہ دھماکا۔ دونوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''تم! تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی؟'' فاخرہ اس تک پہنچ کر غصے سے بولیں۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی طرح ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا بولا۔

''تین ہفتے بعد آیا ہوں، اس لئے غصہ دکھا رہی ہیں ساسو جی! درست ہے آپ کا

غصہ۔ لیکن ان سالوں نے کچھ مرمت ہی اس بے جگری سے کی تھی کہ زخم بھرنے اور ٹوٹے ہاتھ کا پلستر کھلنے میں دو ہفتے لگ گئے۔ ایک ہفتہ رخسانہ کو یہ یقین دلانے میں لگ گیا کہ میں نے خضریٰ کو طلاق دے دی ہے۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یقین آتے ہی اس نے میری نگرانی بند کرا دی اور میدان صاف دیکھ کر میں یہاں چلا آیا۔''

''اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو یہاں آنے کی بجائے سمندر میں ڈوب مرتے۔'' خضریٰ اسے گھور کر بولی۔

''عجیب بیوی ہو، شوہر کا خوشی خوشی استقبال کرنے کی بجائے کیسی بے سروپا باتیں کر رہی ہو۔ چلو تیار ہو جاؤ، میں تمہیں سمندر کی سیر کروا لاتا ہوں۔'' اس نے نثار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے تم سے، تمہارے نام سے کچھ نہیں لینا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گی۔ گلی کے بچے پاگل سمجھ کر تمہیں پتھر ماریں گے۔''

''ساسو جی! یہ تربیت کی ہے تم نے اپنی بیٹی کی؟''

''تم جیسے سے تو پھر بھی خاصی بہتر کی ہے۔'' وہ خاصی ترکی بہ ترکی بولی۔

''کیوں بحث کرتی ہو، میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جس کا کبھی تصور بھی......''

''شٹ اپ، نکل جاؤ، فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔'' وہ زور سے چیخی تھی۔

زندگی ایک دم ہی بوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے غم کو فاخرہ نے جی کا روگ بنا لیا تھا۔ بیمار تو وہ ایک عرصے سے تھیں کہ غربت و بے چارگی دنیا کی بدترین بیماری ہے۔ بیٹی پر گزرنے والی قیامت نے انہیں موم کی طرح اندر ہی اندر پگھلانا شروع کر دیا تھا۔ رافع فیاض، خضریٰ سے دستبردار ہونے کو راضی نہ تھا۔ اکثر اوقات آن دھمکتا اور یہی مطالبہ کرتا کہ خضریٰ اس کی بیوی ہے اور وہ اسے ساتھ لے کر جائے گا۔ یہ بات خضریٰ کسی طور ماننے کو تیار نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا وہ دل میں اس سے تعلق توڑ چکی ہے۔ اب وہ مانے یا نہ مانے مگر وہ اسے اپنا شوہر نہیں مانتی۔ اسی کشمکش کے دوران وہ ایک رات ایسی

سوئیں کہ پھر کبھی اس رات کی صبح نہیں ہوئی۔ انابی اور خضریٰ کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے چلی گئیں......!

وقت گزرتا رہا اور احساس دلانے لگا کہ اسے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گھر سے باہر قدم رکھنا پڑے گا۔ بہت کوشش کے بعد ایک پرائیویٹ انگلش اسکول میں اسے جاب ملی تھی جہاں محنت بہت زیادہ اور سیلری برائے نام تھی۔ مشکل سے دال روٹی مل پاتی تھی۔ اس دوران رافع فیاض نے انہونی بات کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی کے لئے اس سے فاخرہ نے ایک لاکھ ادھار لئے تھے جو ایک سال بعد واپس کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

''دھوکے باز انسان۔ یہ تمہاری کوئی نئی گھٹیا سازش ہے۔ شرم نہیں آتی میری مرحوم ماں پر جھوٹے الزام لگاتے ہوئے۔ کچھ تو اللہ کا خوف کرو۔ کیا تمہیں موت نہیں آئے گی؟ کیوں میری مظلوم ماں کی روح کو آزار پہنچا رہے ہو؟'' وہ غضب ناک انداز میں بولی تو وہ اطمینان سے بولا۔

''اگر تمہاری ماں نے تمہیں نہیں بتایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''ارے میاں! ہم کیسے یقین کرلیں۔ میرے سامنے خود فاخرہ نے سب کچھ اپنے پاس سے کیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات چھپانے والی نہیں تھی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ضرور ذکر کرتی۔ ایک لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔'' انابی بھی سخت لہجے میں اس کی بات کی نفی کرتی ہوئی بولیں۔

''بس......'' وہ ہاتھ اٹھا کر تحکم بھرے انداز میں گویا ہوا۔ ''مجھے میری رقم جلد از جلد مل جانی چاہئے۔ جتنی جلد میری رقم ادا کرو گی اتنی ہی جلد میں تمہیں آزادی کا پروانہ دے دوں گا۔ مگر ایک سال کے اندر اندر میری رقم مجھے نہ ملی تو یاد رکھنا کبھی طلاق نہیں دوں گا۔''

اسے معلوم تھا وہ دھمکی محض دھمکی نہیں ہے بلکہ اس کی سازش کا حصہ ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اس نے گھٹیا ترین چال چلی تھی ورنہ وہ اپنی ماں کی خوددار اور غیور

طبیعت کو اچھی طرح جانتی تھی۔ جس عورت نے فاقوں کی حالت میں کسی سے ایک روٹی مانگنا گوارا نہیں کیا وہ بھلا بیٹی کی شادی کے لئے اس شخص سے قرض لیتیں جو ان کا داماد بننے والا تھا؟

''فاخرہ ایسی نہیں تھی۔ وہ کبھی اتنی بڑی رقم بطور قرض نہیں لے سکتی تھی۔'' اس کے جانے کے بعد انابی خضریٰ سے مخاطب ہوئیں۔

''مجھے معلوم ہے انابی! اور وہ ذلیل کس وجہ سے ایسا کر رہا ہے، وہ بھی آپ جانتی ہیں۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم سچ کو سچ ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔''

''میری بھی آنکھیں ساتھ چھوڑنے لگی ہیں ورنہ سلائی کڑھائی کے روپوں سے دال روٹی مل ہی جاتی تھی۔ اب تم صبح سے نکلی شام کو آتی ہو۔ اتنی محنت کے باوجود اسکول والے چند سو روپے پکڑا دیتے ہیں جو بجلی اور گیس کے بل بھرنے کے بعد گنتی کے بچتے ہیں۔ پھر پورا مہینہ جس طرح گزرتا ہے، صرف اللہ ہی جانتا ہے۔''

''آپ فکر مت کیجئے انابی۔ میں نے ایک بڑی جگہ اپلائی کیا ہے۔ شاید وہاں ملازمت مل جائے۔ خاصی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ خاصی بڑی کمپنی ہے۔ آپ ایسا کریں اوپر کے پورشن کو کرائے پر دے دیں۔ میں سب سے پہلے اس خبیث شخص کے جھوٹے قرض سے آزاد ہونا چاہتی ہوں ورنہ ہم دو افراد کے لئے اتنی تنگ و دو کی ضرورت نہیں تھی۔''

''اللہ ہی ہمارا انتقام لے گا ظالم رافع فیاض سے۔ دھوکے سے شادی کی اور منحوس سارا جہیز بھی ہڑپ کر گیا۔ وہ تو مجھے ہی اوسان آ گیا تھا، وداع کے وقت جو میں نے تمہاری چوڑیاں اور کنگن فاخرہ سے یہ کہہ کر تمہاری کلائیوں سے اتروا لئے کہ ولیمے پر پہنا دیں گے۔ کانچ کی چوڑیوں نے کلائیوں میں جگہ ہی کہاں چھوڑی تھی۔ اس طرح یہ بچ گئیں۔''

''میں نے یہ سوچ کر صبر کرلیا انابی! وہ ہماری جانوں کا صدقہ گیا۔ آپ بھی یہی سوچ لیں۔'' اس نے دھیمے سے مسکرا کر انہیں سمجھایا تو وہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئیں۔

''آہ! ماضی کس طرح اس کے ذہن کی اسکرین پر روشن ہو گیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے گزر کر صبح کے روشن اجالے میں ڈھل چکی تھی۔ ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ آنکھیں جو ماضی و حال کے تکلیف دہ وقت کے احساس سے مسلسل برس رہی تھیں، بری طرح سرخ ہو کر سوج گئی تھیں۔ اسی دم غنودگی سی اس پر چھائی تھی۔

☼☆☼

''سائیں! یہ تو دوستی والی بات نہ ہوئی نا۔ رات آئے اور اب جانے کی بات کر رہے ہو۔ کچھ دن رُکو ابھی۔ کیوں ہماری عزت مٹی میں ملانا چاہتے ہو۔ وجاہت سومرو کی مہمان نوازی کے گن تو دشمن بھی گاتے ہیں۔ پھر تو تم جگر جان ہو ہمارے۔ اس طرح نہیں جانے دیں گے۔'' سومرو نے اسے بڑے دلار سے روکنا چاہا۔

''یار! مجھے فخر ہے تمہاری دوستی پر۔ جانتا ہوں تمہاری محبت کو۔ لیکن اس وقت میں عجیب ٹینشن کا شکار ہوں۔'' اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کی روشن پیشانی پر سوچیں شکنوں کی صورت میں ابھر آئی تھیں۔ سحر انگیز مغرور آنکھوں کی سرخی میں الجھنیں تیرنے لگی تھیں۔ ''سمجھ میں نہیں آتا، آگے بڑھوں یا کراچی واپس لوٹ جاؤں؟''

''ہوں......'' وجاہت سومرو اس کے قریب بیٹھ کر اس کی جانب بغور دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''اس بار تم بہت بدلے بدلے نظر آ رہے ہو۔''

''وہم ہے تمہارا۔ بھلا مجھے کون بدل سکتا ہے؟'' وہ دھیمے سے مسکرایا۔

''وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ آئی ہے اور تم پہلی دفعہ کسی لڑکی کو ساتھ لا کر کمرے میں تنہا سوئے ہو اور اس کی وجہ سے تم نے ڈیرے پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ شانزل خان کسی کا پابند نہیں ہو سکتا اور وہ بھی خصوصاً کسی لڑکی کا۔'' ایک لمحے کو اپنا لہجہ اسے خود اجنبی اور کھوکھلا لگا تھا مگر فوراً ہی اس نے اندر ابھرتے اضطراب پر قابو پا لیا تھا۔

''اس سے قبل تو تمہیں کبھی کسی معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ نہ کبھی معمولی سی ٹینشن بھی کبھی تمہیں چھو کر گزری تھی، پھر اب کیا ہوا؟'' وجاہت سومرو گہری نگاہوں سے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ خضرٰی حیات کی حیثیت بھی انہی لڑکیوں جیسی ہے جو محض وقت گزاری کا سبب بنتی ہیں۔ بعد میں حرف غلط کی طرح ذہن سے جن کے نام اور چہرے مٹ جاتے ہیں۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''کاش...... تمہاری آنکھیں بھی تمہارے لہجے کا ساتھ دیتیں تو میں یقین کر لیتا۔''

''وہ شادی شدہ لڑکی ہے، اس لئے کسی بھی خیال کو دل سے نکال دو۔ اس کی فضول ہٹ دھرمی، ضد اور اکڑ نے اب تک مجھے ضد پر اکسایا ہوا ہے۔ جس وقت وہ اپنی اصلیت پر آئی، چند گھنٹوں کو رنگین بنا کر بھول جاؤں گا اسے۔''

''نہ معلوم کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے...... خیر کچھ نہیں۔ میں تمہیں ابھی نہیں جانے دوں گا۔'' وجاہت سومرو نے دانستہ اس کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

شانزل نے اس کی ادھوری بات جاننے کی کوشش نہیں کی اور مزید یہاں ٹھہرنے سے معذرت کر لی۔ اپنی اس نئی بے چینی اور اضطرابی کیفیت کو وہ خود بھی نہ جان پایا تھا۔

''صاحب! بی بی صاحبہ دروازہ نہیں کھول رہی ہیں۔ صبح سے کئی بار کھٹکھٹا چکا ہوں۔''

''وہاٹ؟'' نور محمد کی اطلاع نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

''گھبراؤ نہیں۔ اگر تم اجازت دو تو ملازم روشن دان سے اندر جا کر دروازہ کھول دے گا۔'' وجاہت سومرو نے کہا۔

پوری طاقت سے دروازہ دھڑ دھڑانے کے باوجود بھی اندر سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی تو وجاہت سومرو نے اجازت طلب کی اور اس کا جواب پاتے ہی ایک ملازم چھت کی طرف چلا گیا تا کہ وہاں سے روشن دان کے ذریعے کمرے میں داخل ہو سکے۔

''اوہ...... اتنی دیر...... وہ کب اندر داخل ہو گا؟'' وہ از حد متوحش تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کچھ نہیں ہو گا۔ روشن دان بہت اونچا ہے، اسے نیچے اترنے میں چند منٹ تو لگیں گے۔''

''تم نہیں جانتے، وہ نہایت احمق لڑکی ہے۔ کہیں اس نے...... کہیں اس نے خودکشی نہ کر لی ہو۔'' وہ نہایت پریشانی سے بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ گھبراؤ نہیں۔'' وجاہت سومرو نے خلوص سے تسلی دی۔

اسی دم ملازم نے دروازہ کھول دیا تو وہ وحشت زدہ سا اندر بڑھا تھا۔

بیڈ پر اُسے بے سدھ پڑے دیکھ کر وحشت سے چیخا۔

''دیکھا...... دیکھا تم نے۔ ہو گئی نا وہی بات۔ خودکشی کر لی نا اس نے۔''

✲✫✲

وہ متوحش سا بیڈ کی طرف بڑھا۔ خضریٰ بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ شازل نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض چیک کی جو بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ اس کے اندر چلتی آندھیاں شدت اختیار کرنے لگیں۔

''کیا ہوا؟'' وجاہت سومرو کچھ فاصلے پر کھڑا اس کی اضطرابی حرکات کا بغور جائزہ لے رہا تھا، اس کے چہرے پر پھیلتی وحشت اور پریشانی کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''وجی...... وجی! یہ زندہ ہے لیکن حالت بہت سیریس ہے۔ ڈرائیور کو کہو کار نکالے۔ میں اس کو ہاسپٹل لے کر جاؤں گا۔''

وجاہت سومرو بھی فکر مند ہو گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا وہ باہر آیا تھا اور ڈرائیور سے اپنی گاڑی باہر نکلوائی تھی۔ پیچھے پیچھے شازل چلا آیا تھا، بہت احتیاط سے دونوں بازوؤں میں بیہوش خضریٰ کو اٹھائے ہوئے۔ یہ گاؤں کسی اعلیٰ اور بہترین ہاسپٹل کی سہولت سے محروم تھا۔

درمیانے احاطے میں بنی تین کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل وہ واحد ڈسپنسری تھی جہاں مجبوراً انہیں خضریٰ کو لانا پڑا تھا۔ وجاہت سومرو کو وہاں دیکھ کر ہلچل سی مچ گئی تھی۔ خضریٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

''یہ...... یہ لوگ کامیاب تو ہو جائیں گے نا؟ بچا لیں گے اسے؟'' شازل جو مسلسل اِدھر اُدھر چکر لگا رہا تھا، وجاہت کے قریب آ کر بولا۔

''شاید۔ اچھی امید رکھو۔ امید پر دنیا قائم ہے۔'' اس نے تسلی دی۔

''ہوں...... کتنے افسوس کی بات ہے۔ اتنے وسیع علاقے کے مالک ہو کر، بے پناہ

دولت کے وارث ہونے کے باوجود تم یہاں ایک اچھا ہاسپٹل تک نہیں بنوا سکے؟ کیا ہوتا ہو گا یہاں ہزاروں بسنے والوں کا جب وہ ایسی کسی سنگین صورتحال یا بیماری کا شکار ہو جاتے ہوں گے۔ یقیناً مر جاتے ہوں گے۔ ان کی استطاعت یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہو گی۔ کیونکہ نہ ان کے پاس تمہاری طرح ہوا کے دوش پر اڑنے والی گاڑیاں ہیں، نہ بے پناہ دولت کا تحفظ اور نہ ہی شہروں میں بہترین و اعلیٰ شخصیات سے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ لعنت ہے ایسی دولت پر جو عیش و عشرت اور ہوس پرستی پر تو بے حساب نچھاور کی جائے مگر غریبوں کو ان کے انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا جائے۔" شانزل خان کے تاسف زدہ لہجے میں ایسی کوئی بات تھی کہ چند لمحے وجاہت سومرو نگاہیں از حد شرمندگی و ندامت کے باعث اٹھا نہ سکا۔ وہ شانزل خان کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ پڑھائی کے دور کا بہت سا وقت اس نے کینیڈا میں اس کے ساتھ گزارا تھا۔ شانزل خان کھلی کتاب کی مانند تھا۔ اپنی زندگی کی کتاب کے سفید و سیاہ اوراق وہ کسی سے مخفی رکھنے کا روادار نہ تھا۔ بے شک اس میں وہ ساری خامیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو اس جیسے از حد مردانہ وجاہت کے ساتھ ساتھ دولت کو بے دریغ استعمال کرنے والے شخص میں موجود ہوتی ہیں اور یہ بھی حقیقت تھی کہ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تمام حدود پار کر جاتی تھی جن میں صد فی صد خواہشات لڑکیوں کی ہوتی تھیں۔ ایک طرف اس کے کردار میں جھول تھا تو دوسری طرف غریبوں کی امداد وہ بہت فراخ دلی سے کرتا تھا۔ ظاہری و خفیہ دونوں طریقوں سے۔ کئی ٹرسٹ اور ادارے اس کے زیر سرپرستی چل رہے تھے جس کا اس نے کبھی چرچا نہیں کیا تھا۔

اس وقت اس کی خفگی بھری تاسف زدہ آواز وجاہت سومرو کو آئینہ دکھا گئی تھی۔

"سوری یار! میں تو خود کو اپنے بزرگوں سے بہت بہتر اور انصاف پسند حکمران سمجھتا تھا۔ لوگوں کو معمولی سی سہولیات دے کر مطمئن تھا کہ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن نہیں، اندر سے میں بھی روایتی وڈیرہ نکلا۔ کم ظرف، بے احساس۔ مظلوم غریب لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھنے والا گناہ گار انسان۔"

"تمہیں معلوم ہے مجھے محض دعوے، باتیں اور وعدے کرنے والے لوگوں سے اس قدر چڑ ہے جتنی ہم کسی مُردہ خور جانور سے کرتے ہیں۔ بہتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں، وہ کرتے ہیں۔ وہ وعدوں اور بکواس میں وقت کا زیاں کرنے کی بجائے کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔

"او کے..... اگلی بار آؤ گے تو دیکھنا وجاہت سومرو بکواس کرنے والا بندہ ہے یا کر کے دکھانے والا" اُس کے لہجے میں نئے عزم و ولولے کا جوش تھا۔

اسی وقت اندر سے ادھیڑ عمر ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر دو نرسوں کے ہمراہ باہر آئے۔

"مبارک ہو سائیں! خطرہ ٹل گیا ہے۔ مریضہ اب بالکل ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے وجاہت سومرو کے قریب آتے ہوئے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"اوہ، تھینکس گاڈ....." وہ بے اختیار اندر چلا آیا۔

خضریٰ آنکھیں بند کیے بیڈ پر لیٹی تھی۔ دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ نامعلوم دوائیوں کے زیر اثر سو رہی تھی یا اسے دیکھ کر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

وہ بیڈ کے قریب کھڑا اُسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ اس کے زرد چہرے پر ستواں کھڑی ناک، سیاہ بھونرا جیسی پلکیں بہت نمایاں ہو رہی تھیں۔

"خضریٰ!..... خضریٰ!" اُس نے جھک کر دھیرے دھیرے پکارا مگر اس میں کوئی جنبش بھی نہ ہوئی تو وہ وہیں بیٹھ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر گویا ہوا۔

"اب..... کیسی طبیعت....."

"چھوڑو..... میرا ہاتھ چھوڑو۔" جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی وہ آنکھیں کھول کر چیخی۔

شانزل خان نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اُس کی لرزتی پلکوں کی جنبش سے سمجھ گیا تھا کہ وہ جان کر آنکھیں بند کیے پڑی ہے۔ اسے حرکت میں لانے کے لئے اس نے ہاتھ پکڑا تھا جس کا نتیجہ سو فیصد درست نکلا تھا۔

"ناراض مت ہو، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ طبیعت کیسی ہے؟ کیا کر لیا تھا؟"

"شکر کیجیے سائیں، بچھو زیادہ زہریلا نہیں تھا۔" وجاہت سومرو کے ہمراہ اندر آتے

ڈاکٹر کی گفتگو سن کر وہ چونک کر بولا۔

''کیا انہیں بچھو نے کاٹا تھا؟''

''جی ہاں۔ خوش نصیبی ہے بیگم صاحبہ کی کہ وہ بچھو معمولی سا زہریلا تھا ورنہ اس علاقے میں تو اتنے خطرناک سانپ بچھو موجود ہیں کہ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ لمحوں میں آدمی جان دے دیتا ہے۔'' ڈاکٹر، وڈیرے اور اس کے دوست کو یہاں دیکھ کر ازحد مرعوب ہوا تھا کیونکہ وجاہت سومرو سے وہ واقف تھا اور شانزل کی شاندار و بارُعب شخصیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی طور پر وجاہت سومرو سے کم حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ ان کے لئے اس نے اپنی طرف سے ڈسپنسری کے پیچھے بنے اپنے گھر میں پُرتکلف چائے کا اہتمام کر ڈالا تھا اور اب بہت اصرار سے انہیں دعوت دے رہا تھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ کی بے حد مہربانی ہے کہ آپ نے ہماری مہمان کی جان بچائی۔ چائے وغیرہ کا تکلف چھوڑیں۔ ہم حویلی جا کر چائے پئیں گے۔'' وجاہت سومرو نے کہا۔

''مہربانی تو اللہ کی ہے سائیں۔ اس نے آپ کے ساتھ میری بھی لاج رکھ لی۔ آپ اپنے مہمانوں کو لے کر غریب خانے پر چائے پی لیں گے تو عزت افزائی ہوگی مجھ حقیر بندے کی۔'' ڈاکٹر پُرخلوص اور مہمان نواز تھا۔ اس کے لہجے سے کوئی غرض و خوشامد نہیں جھلک رہی تھی۔ وجاہت سومرو کے دوبارہ انکار کرنے سے قبل وہ بول اٹھا۔

''ان کی ڈرپ ختم ہو جائے ڈاکٹر صاحب تو ہم ضرور آئیں گے۔ یہ ہمارے لئے سعادت و مسرت کی بات ہے کہ آپ جیسے نیک اور انسانیت کی خدمت کرنے والے عظیم انسان سے ملاقات کا شرف نصیب ہو رہا ہے۔'' شانزل کے ان تحسین آمیز الفاظ نے ڈاکٹر کے چہرے پر چراغ سے روشن کر دیئے تو وہ شکریہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں نے اسی لئے انکار کیا تھا کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ کہ

ایک ادنیٰ ڈاکٹر کی دعوت میں نے قبول کر لی۔'' ڈاکٹر کے باہر جاتے ہی وجاہت سومرو بولا۔

''ایک عرصہ سنگ رہنے کے باوجود تم میری نیچر کو نہ سمجھ پائے۔ اب سوائے حیرت و افسوس کے کیا کر سکتا ہوں۔'' شانزل نے سنجیدگی سے کہا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ شام کے سرمئی سائے دُور اُفق کے کناروں پر پھیل رہے تھے۔ خضریٰ کی طبیعت اب بہتر تھی مگر اس کی بیزاری و خاموشی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''پلیز وجی! اب اصرار نہ کرنا، میں نے تمہیں کہا تھا نا اگر ایک بار کوئی ارادہ کر لوں تو اس سے دستبردار ہونا میرے لئے قطعی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اپنی یہ عادت مجھے بھی قطعی ناپسند ہے لیکن اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ اسے چھوڑنا چاہتا ہوں مگر یہاں میں خود سے شکست کھا جاتا ہوں۔'' باہر حویلی جانے والے راستے پر وجاہت کو کار لے جانے کا اشارہ کرتے دیکھ کر شانزل نرمی سے بولا۔

''اچھا۔ تم کبھی نہیں سدھرو گے۔ ہمیشہ اپنی ضد پوری کرتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ لیکن جانے سے قبل وعدہ کر کے جاؤ، بہت جلد ملنے آؤ گے۔''

''کیوں، تمہارے لئے کیا وہاں نوانٹری کا بورڈ آویزاں ہے؟''

''نہیں بابا! ایسا کیوں ہوگا۔ بس زمینوں کے جھگڑے ہیں جنہیں نمٹاتے نمٹاتے بھی کچھ عرصہ باہر نہیں نکل سکتا۔ آؤں گا، بکھیڑوں سے نمٹتے ہی آؤں گا۔ ایک احسان کرو، اپنا ڈرائیور ایک ہفتے کے لئے مجھے دے دو۔ بڑے کام ہیں مجھے۔ میرے دونوں ہی ڈرائیور بیمار پڑے ہیں۔'' وجاہت سومرو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی احسان کی بات نہیں ہے۔ نور محمد حویلی میں ہی ہے۔ رکھ لینا اسے جب تک تمہارا کام نہیں ہو جاتا۔ میرے پاس بندے اور بھی ہیں۔'' شانزل خان نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں دوست گلے ملے، کچھ رسمی باتیں ہوئیں پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو الوداع کہتے اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔ وجاہت سومرو اس وقت تک ہاتھ میں پکڑا رومال ہلاتا رہا جب تک ان کی کار نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

※☆※

شام کی جانب بڑھتے سایوں میں گاؤں کے مناظر دلکش، سرسبز و شاداب سبزی کی مانند لگ رہے تھے۔ وہ کتنی خواہش مند تھی ایسے حسین اور قدرت سے قریب تر کردینے والے نظارے دیکھنے کی۔ اب خواہش مکمل ہوئی بھی تو بدمزہ تھی۔

خواہشات کا وجود بھی عجیب ہے۔ ذہن میں اس طرح اُگ آتی ہیں جیسے خودرو پودے بے طلب ہی زندگی پالیتے ہیں لیکن ان کی جڑیں خواہشوں کے پودوں کے مقابلے میں بہت طاقتور و مضبوط نہیں ہوتی ہیں۔ خودرو پودوں کو ایک ہی جھٹکے میں جڑوں سمیت اُکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور ان خواہشوں کی جڑیں تو انسان کو آکاس بیلوں کی مانند جکڑ لیتی ہیں۔ انسانی وجود ہی خواہشوں کی بنیاد ہے شاید، جبھی زیست کے ہر لمحے میں خواہشیں مکڑی کے جالوں کی مانند ہم سے لپٹی نظر آتی ہیں۔ ایک پوری ہو جائے تو دوسری، تیسری بلکہ آخری سانس تک ساتھ رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض خواہشیں جو بڑی زور آور ہوتی ہیں، جن کے پورا ہونے کا ہم انتظار کرتے ہیں، وہ اگر قسمت سے کبھی پوری ہو بھی جائیں تو اذیت ناک بن جاتی ہیں۔ جیسا اب اس کے ساتھ ہورہا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔'' وہ نہ جانے کب سے پکار رہا تھا۔ اب کار ڈرائیو کرتے کرتے لمحے بھر کو اس کی جانب دیکھ کر بولا تو وہ ذرا سی چونکی تھی۔ جواب تو اسے کچھ نہیں دیا، صرف ایک نگاہ اس کی جانب دیکھ کر دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''آگے آجایئے۔ مجھ سے تنہا بیٹھ کر ڈرائیونگ نہیں ہوتی۔'' بہت فراخ دلی سے اس کی ناگواری نظر انداز کر کے وہ بشاش لہجے میں گویا ہوا۔

''میں آپ کی کسی بھی فضول عادت کو جاننا نہیں چاہتی اور نہ ہی پورا کرنے کی پابند ہوں۔ سمجھے؟'' وہ اس کی جانب دیکھے بغیر سخت لہجے میں بولی۔

''میں آپ کا ڈرائیور نہیں محترمہ اکم آن۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

''مجھے کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔''

''اوکے۔ تو مجھ پر بھی کسی کی دھونس نہیں چل سکتی۔'' اُس نے کار روک دی۔

''یہ..... یہ، کیا مقصد ہے؟'' اُسے کار روکتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔

''کار تب چلے گی جب آپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھیں گی ورنہ میرے لئے کوئی مشکل نہیں ہے اس طرح بیٹھے بیٹھے یہیں رات گزار دینا۔''

''خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہیں آپ۔'' خضریٰ نے شدید غصے سے کہا تھا۔ شانزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور بونٹ پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر لاپرواہی سے دیکھنے لگا۔

شام کا گلابی آنچل ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ رخصت ہوتے سورج کی سنہری کرنیں اپنے روپ کا سونا خوب لٹا رہی تھیں۔ شہر کی آلودگی سے پاک فضا میں محسوس کی جانے والی تازگی و لطافت تھی۔ اردگرد کھیت پھیلے ہوئے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔

گاؤں کے کچے گھروں سے اٹھتی تازہ پکتی مکئی کی روٹی اور ساگ کی خوشبو ہواؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبوئیں اتنی اشتہا انگیز تھیں کہ اسے محسوس ہوا کہ بڑی شدت سے بھوک لگ رہی ہے۔ رات بھی اس نے برائے نام کھایا تھا اور اب صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ چائے پر شانزل کے علاوہ ڈاکٹر، اس کی وائف اور وجاہت سومرو نے از حد اصرار کیا تھا لیکن اس کی سرد مہری و خاموشی کے آگے وہ خاموش ہو گئے تھے اور اسے ان کی رتی بھر پرواہ نہیں تھی۔

آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا ان دونوں کو اپنی اپنی فضول ضدوں میں مقید ہوئے۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' وقت تیزی سے گزرتا دیکھ کر بالآخر اُسے کہنا پڑا۔

''صرف کچھ وقت۔ حسین لمحوں کی قربت کا تمنائی ہوں۔'' اُس نے جھک کر ذومعنی لہجے میں کہا۔ اس کی سرخ سرخ سحر انگیز نگاہوں میں وہی وحشیانہ چمک اُبھر آئی تھی جس کے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر پڑتے ہی لاشعور میں کوئی انجانا سا خوف کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا جواب اس کے لئے امتحان بن کر سر پر سوار ہو چکا تھا۔

''میرا مطلب ہے آگے آ کر بیٹھ جاؤ۔'' خضریٰ کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے بات بدلی تھی۔

اس کی ہٹ دھرمی خضریٰ کو اپنی بے بسی و مجبوری کا مکمل احساس دلانے لگی۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ سے اٹھ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''بہت بہت شکریہ۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ شوخی سے بولا۔

وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ خضریٰ دروازے کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی، گویا اس نے چھونے کی بھی کوشش کی تو وہ دروازہ کھول کر باہر کود جائے گی۔

وقت کی رفتار کار کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کی گلابی رنگت رات کی سیاہی میں بدل چکی تھی۔ دن کی روشنی میں نگاہوں کو سرشار کر دینے والا سبزہ اب تاریکی میں ڈوبا اتنا ہی خوفناک لگ رہا تھا کہ اس پر نگاہ ڈالنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔

اُس نے کلائی پر بندھی واچ میں ٹائم دیکھا تو حیرانی سے گویا ہوئی۔

''کیا واقعی آٹھ بجے ہیں؟''

''ہوں۔''

''لیکن یہاں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔''

''یہ گاؤں ہے۔ غیر ترقی یافتہ اور پسماندگی کا شکار۔ بجلی اور گیس جیسی ضروری سہولیات ابھی یہاں میسر نہ ہو سکی ہیں۔ شہروں کی چکا چوند میں تو اس وقت ڈھنگ سے رات بھی شروع نہیں ہوتی لیکن ایسے دیہاتوں کے لوگ کم از کم میرے خیال سے تو خوش نصیب ہیں کہ اس دور میں بہت صاف و شفاف آب و ہوا میں سانس لے رہے ہیں جو ہم لوگوں کے لئے صرف خواب بن گئی ہے۔ کتنا فطرت سے قریب ہیں یہ لوگ۔ سادہ زندگی، سادہ ماحول، نمود و نمائش سے پاک لوگ جو صبح سورج نکلنے سے پہلے جاگ جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے کے بعد جن کی رات شروع ہو جاتی ہے۔ ہم سے بہتر ہیں یہ لوگ، وقت کی قدر کرنے والے، جو وقت کے پیچھے نہیں بلکہ وقت جن

کے پیچھے چلتا ہے۔'' شانزل کے لہجے میں یہاں کے لوگوں کے لئے ستائش تھی۔ جب وہ ایسی باتیں کرتا تھا تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک خراب شخص ہے کیونکہ بظاہر وہ بہت زبردست پرسنالٹی رکھتا تھا۔ نرم خو، خوش اخلاق، لوگوں سے ملتے وقت وہ امیری غریبی کا فرق بالکل مٹا دیا کرتا تھا۔ اپنی امارت کے حوالے سے اس میں رتی بھر بھی غرور و تکبر نہ تھا۔

''شانزل خان! کاش تم ایک بدکردار شخص نہ ہوتے تو معتبر سمجھے جاتے۔'' اُس کی باتوں سے متاثر ہو کر اس نے دل میں سوچا۔

کار اچانک ہی جھٹکے سے چلتے چلتے رُک گئی۔

''اوہ...... پٹرول چیک کرنا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔''

''کیا...... پٹرول ختم ہو گیا؟''

''ہاں۔'' شانزل کے لہجے میں پریشانی محسوس کر کے وہ خود بھی پریشان ہو گئی۔

''اب کیا ہوگا؟ پٹرول کہاں سے ملے گا؟ میں نے تو یہاں کوئی پٹرول شاپ دیکھی نہیں۔ اور اندھیرا ابھی اس قدر ہے۔''

''گھبراؤ نہیں۔ کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہوں۔'' اُسے پریشان اور گھبرایا ہوا دیکھ کر اس نے نرم لہجے میں تسلی دی۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہارے اندر پھیلی شیطنت اور ہوس کی وجہ ہے۔ نامعلوم تم جیسے کم ظرف و بے ضمیر لوگوں کو اوپر والا اتنا کیوں نواز دیتا ہے کہ تم لوگ آپے سے باہر ہو کر خود کو خدا سمجھنے لگتے ہو۔ اور خدائی کے دعوے کرنے والے شیطانوں کے عبرت ناک انجام سے باخبر ہونے کے باوجود نفس کے گھوڑے پر دوڑتے رہتے ہو، بدکار لوگ۔'' خضریٰ کے لہجے میں وہی بے پناہ نفرت و حقارت سمٹ آئی تھی جو شانزل کی رگ رگ میں تذلیل و تحقیر کے انگارے دہکا دیا کرتی تھی۔

''خضریٰ حیات! حد میں رہو اپنی۔''

''کیا تمہارے لئے کوئی حد متعین نہیں ہے؟''

”کیا، کیا ہے میں نے؟ کون سی حد پار کی ہے؟“ وہ زیادہ دیر اپنے درشت لہجے پر قابو نہ پاسکا۔

”اونہہ...... کیا، کیا ہے میں نے۔ تمہارے پاس ضمیر ہی کہاں ہے جو معلوم کر سکو کہ کیا، کیا ہے تم نے؟“ وہ غصے سے شانزل کے الفاظ دہرا کر بولی۔

”اوہ اچھا۔ شاید تمہیں اپنا ہسبنڈ یاد آ رہا ہے۔ تم اس سے اسی طرح لڑتی ہو گی۔ تب ہی...“

”شٹ اپ۔“

”نیور مائنڈ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ خوشی ہے کہ اسی حساب سے میرے لئے تھوڑی گنجائش اور نکال لو۔ یعنی لڑائی کے بعد پیار کا مرحلہ......“

”تم...... تم...... آگے ایک لفظ بھی کہا تم نے تو میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔“

”اوکے...... اوکے، ریلیکس۔ یہ لڑائی اور پیار کے مرحلے تو ہم بعد میں طے کریں گے۔ پہلے یہ مسئلہ تو حل ہو کہ اب کیا کرنا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں شوخی اور لبوں پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ اس کے غصے سے ازحد انجوائے کر رہا ہو۔

خضریٰ نے کچھ نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں اسے خوب کوسنوں سے نواز رہی تھی۔

شانزل کار سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دونوں اطراف نہ معلوم کس چیز کے کھیت تھے جن کی اونچائی کے باعث کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر صرف اور صرف گھور اندھیرے کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ ان کی کار درمیانی سڑک پر تھی جس کے دونوں جانب ان کھیتوں کا سلسلہ بہت آگے تک چلا گیا تھا۔

وہ دانت بھینچے شانزل کو دیکھ رہی تھی جو نہایت اطمینان سے تھوڑا سا جائزہ لے کر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا رات اسی طرح گزرے گی؟“

”نہیں...... اگر تم چاہو تو بہت خوشگوار گزر سکتی ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر پھر معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

”تم یہی حسرت دل میں لے کر مر جاؤ گے۔ تم مجھے تو کیا میری پرچھائیں کو بھی نہیں پا سکتے۔ سمجھے؟“

”چیلنج کر رہی ہو؟“ اس نے جھک کر اس کی نگاہوں میں جھانکا۔

”جو سمجھو۔“ اس کے جیسے ہوش و حواس معطل ہو گئے تھے۔

”تمہیں گھمنڈ کس بات پر ہے؟ کیا سمجھتی ہو خود کو؟“ اس کے لہجے میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ مزید اس کے کہ بات بڑھتی، لمحہ بھر میں اس نے اُبھرتے غصے پر قابو پا لیا۔ دوسرے لمحے وہ بہت پُرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا، گویا ان کے درمیان کوئی بدمزگی ہوئی ہی نہ ہو۔ یہی خصوصیت اس کے شاطر اور خطرناک ہونے کی دلیل تھی۔ دشمن وہی زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو ٹھنڈا مزاج رکھتا ہو اور جذبات پر قابو رکھنا جانتا ہو۔ وہ اسی فطرت کا مالک تھا۔

”ہر وقت غصے میں رہنا بری بات ہوتی ہے۔ فی الحال یہاں اندر بیٹھی رہنا، میں ذرا آگے جاتا ہوں، دیکھتا ہوں کیا صورتحال ہے۔ دوبارہ وہی بے وقوفی مت کرنا جو وجاہت سومرو کے ہاں کر چکی ہو۔ وہاں ہر طرف رات میں اسپرے ہوتا ہے، اس کے باوجود تم بچھو کا شکار ہو گئی تھیں۔ یہاں یقیناً سانپ، بچھوؤں کے علاوہ اور بھی زہریلے کیڑے ہو سکتے ہیں۔“ اس نے ڈرائیونگ ڈور کھولنے سے قبل اسے سمجھا دیا تھا۔

وہ چلا گیا تو خضریٰ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

شانزل تیزی سے آگے کی سمت جا رہا تھا۔ بے اختیار وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ دائیں جانب مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے اردگرد دیکھا اور کھیتوں میں پھیلی تاریکی نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ وہ کیسا بھی تھا لیکن اس کی موجودگی میں تنہائی کا خوف نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے کھڑکی کے شیشے چڑھائے اور نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی اس ارادے سے کہ اب باہر نہیں دیکھے گی۔ مگر سوچ کے برخلاف بے ساختہ اس کی نگاہیں باہر اُٹھ رہی تھیں۔

ہواؤں کے زور سے کھیتوں میں ہونے والی سرسراہٹیں بھی اسے بڑی پُراسرار لگ

رہی تھیں اور دل سوکھے پتے کی مانند کانپ اٹھتا تھا۔

کچھ دیر بعد شانزل ایک شخص کے ہمراہ آتا ہوا نظر آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔

''آ جاؤ باہر۔ شکر کرو یہ نیک فرشتہ اتفاقاً پڑھائی کرتا ہوا مل گیا۔ ورنہ یہاں کے لوگ تو لگتا ہے سورج کے ساتھ ہی نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔'' شانزل فرنٹ ڈور کھول کر اس سے مخاطب ہوا تو وہ بھی کانپتی ہوئی باہر نکل آئی۔ شانزل کار لاک کرنے لگا۔ خضریٰ نے اچٹتی ہوئی نگاہ دوسرے شخص پر ڈالی۔ وہ سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھا جس کے چہرے پر معصومیت اور جھجک تھی۔ وہ نگاہیں جھکائے مودب سا کھڑا تھا۔

''چلو'' وہ کار لاک کر کے آیا تو بولا۔ کار کی ہیڈ لائٹس بند ہو جانے کی وجہ سے وہاں یکدم اندھیرا چھا گیا تھا۔ صرف نیلے آکاش پر چمکتے چاند کی شیتل چاندنی تھی جو وہاں بکھری ہوئی تھی جس سے عجب طلسماتی سحر انگیز ماحول ہو رہا تھا۔

''ہاتھ تھام لو میرا۔ راستہ خراب ہے، کہیں گر نہ جاؤ۔'' خضریٰ کو کئی دفعہ ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر اس نے ہمدردی سے کہا۔

''بے فکر رہیے۔ کم از کم آپ کے سامنے تو میں ہرگز نہیں گر سکتی۔''

''او کے، جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ شانے اچکا کر لاپرواہی سے گویا ہوا اور اس نوجوان کے ساتھ باتیں کرتا چلنے لگا۔

یکلخت کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا تو خوف و دہشت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ دو لمبے بازو فضا میں دائیں بائیں پھیلائے ایک بے تحاشا لمبا وجود کسی دوسری مخلوق کا تھا جس کے چہرے کے خدوخال اتنے ہی بھیانک تھے کہ اس کی بے ساختہ چیخ نکل کر خاموشیوں میں ارتعاش پیدا کر گئی۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا؟'' وہ دونوں جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے، چیخ سن کر برق رفتاری سے اس کی طرف آ کر پوچھنے لگے۔

''وہ...... وہ......'' مارے دہشت کے اس کے لبوں سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

''کون ہے؟ کس سے خوفزدہ ہو گئیں؟'' شانزل اس کے کانپتے وجود کو دیکھ کر نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا۔

''وہ...... وہ کیا ہے؟'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس عجیب و غریب مخلوق کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ کے اشارے پر دونوں نے دیکھا۔

''وہ...... وہ تو جی اسٹیچو ہے۔ دراصل فصل تیار ہو جاتی ہے تو پرندے خراب کر دیتے ہیں۔ پرندوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ایسے اسٹیچو بنائے جاتے ہیں۔ پرندے انہیں انسان سمجھتے ہیں اور فصل سے دور رہتے ہیں۔'' اس نوجوان نے سادگی سے معلومات فراہم کیں تو وہ اپنی بیوقوفی پر ازحد شرمسار ہو گئی۔ شانزل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

''واہ! کیا خوب بنایا ہے بنانے والے نے۔ جب اس بانس کے بنے ہوئے انسان کو دیکھ کر انسان ہی ڈر رہا ہے تو بیچارے پرندے تو دور سے ہی بھاگ جاتے ہوں گے۔'' اس نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ اسے مسکراتے ہوئے وہ دیکھ چکی تھی۔

ایک چھوٹے کمرے اور وسیع کھلے صحن والے گھر میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لڑکے نے جس کا نام منور تھا اور اس کی ماں نے ان دونوں کا بہت گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ پراٹھے، آم کا اچار اور بھنے قیمے سے ان کی خاطر مدارات کی تھی۔

اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ بھوک کتنی ظالم چیز ہوتی ہے۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ کس طرح بھوک سے مجبور ہو کر لوگ کوڑے سے اٹھا کر روٹی کھا لیتے ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر ہی تو لوگ نہ جانے کیسی کیسی آگ میں جلتے ہیں۔

''معاف کرنا صاحب، ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ لوگوں کی خدمت ڈھنگ سے نہ کر سکیں گے۔ جو اللہ نے دیا ہے سب آپ کے لئے حاضر ہے۔'' کھانے سے فارغ ہوئے تو منور کی ماں ان سے عاجزانہ لہجے میں بولی۔

''آپ ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں ماں جی۔ یہ تو آپ کا خلوص اور مہربانی ہے کہ آپ

نے دو اجنبیوں کو اپنے گھر میں ٹھہرنے کی اجازت دی، ہماری خاطر داری کی، ورنہ اس دور میں کہاں ایسی مروت و اپنائیت زندہ رہی ہے۔ لوگ اپنوں سے کتراتے ہیں، بھلا اجنبیوں کے لئے کہاں گنجائش ہوتی ہے۔ گھر میں نہ دل میں، باہر سے ہی فارغ کر دیا جاتا ہے۔'' شازل کے لہجے میں حقیقی خلوص تھا۔

''مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ منور نے مجھے جب بتایا کہ شہر سے گاڑی آ کر یہاں رُک گئی ہے تیل ختم ہونے کی وجہ سے تو میں نے جبھی اس سے کہہ دیا تھا کہ جا کر مہمانوں کو لے آئے۔ کیونکہ یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے اور گھر بھی بہت کم ہیں۔''

''چلئے صاحب! بستر لگا دیئے ہیں۔'' منور نے آ کر اطلاع دی تو وہ اٹھ گئے۔

صحن کے درمیان میں چار پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ پہلے پر منور لیٹ گیا تھا، دوسرے پر اس کی ماں، تیسرا پلنگ خالی تھا، چوتھے پر شازل دراز تھا۔ چاروں پلنگ ترتیب سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچھے ہوئے تھے لیکن تھے ایک ہی لائن میں۔

''کب تک سوچتی رہو گی؟ لیٹ جاؤ آ کر۔'' اُسے بت بنے دیکھ کر شازل کو کہنا پڑا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے سونے کا؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''بہت باوقار و شریفانہ طریقہ ہے۔''

''میں اس طرح نہیں سو سکتی۔''

''پلیز ہر وقت صرف اپنے متعلق نہیں سوچتی رہا کرو۔ تمہاری ''میں'' سے بہت چڑ ہے مجھے۔ کم آن، مت تنگ کرو ان سیدھے سادھے مہمان نواز لوگوں کو، ان کی تھکن کا احساس نہیں ہے تمہیں۔ دیکھو لیٹتے ہی بے خبر سو گئے ہیں۔''

منور کی ماں کے خراٹے صحن میں گونجنے لگے تھے۔ وہ خاموشی سے آ کر سر سے پاؤں تک کھیس لپیٹ کر لیٹ گئی۔ شازل پہلے ہی اپنے پلنگ پر دراز تھا۔

دھیرے دھیرے چلتی ہواؤں کے جھونکوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ سامنے کمرے کے دروازے کے پاس لگی موٹی سی کیل پر لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی روشنی دم بدم دھیمی پڑتی

جا رہی تھی۔ نیم تاریکی اور چاند کی روشنی میں اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی قدیم دور میں داخل ہو گئی ہو۔

سیاہ آسمان پر چاند اور ستارے اتنے روشن و شفاف تھے کہ ان کی روشنی و طلسماتی حسن سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنا خوبصورت آسمان دیکھا تھا۔ شہروں میں فضائی آلودگی نے ایسے حسین نظارے ہم سے چھین لئے ہیں، ایئر کنڈیشن رومز میں بھی وہ سکون و راحت محسوس نہیں ہوتی جو اس وقت اس کچی اینٹوں سے بنے معمولی سے گھر کے صحن میں محسوس ہو رہی تھی۔

اتنا روشن، نگاہوں کو ٹھنڈک پہنچاتا چاند، اس کے اطراف پھیلے تا حد نگاہ ستاروں کی چمک ہیروں کو بھی مات دے رہی تھی۔ اس لمحے وہ سب بھول کر ماحول کے حسن میں کھو گئی تھی۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ چاندنی کا غبار عجب فسوں خیز تھا۔

''ستاروں کی گنتی رہنے دو۔ آج تک کوئی اتنا جینئس پیدا نہیں ہوا جو انہیں اچھی طرح گن سکے۔ رات گہری ہو رہی ہے، پلیز سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔'' معاً تاریکی میں شازل کی نیند سے بوجھل آواز اُبھری۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ وہ تو اُسے سوتا ہوا سمجھ رہی تھی مگر وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

''مجھے اجنبی جگہوں پر نیند نہیں آتی۔''

''وہم ہے تمہارا۔ نیند تو وہ ظالم شے ہے جو سولی پر بھی آ جاتی ہے، پھر یہاں تو ماحول ہی بہت سحر انگیز ہے۔'' اس کی بھاری آواز گونجی۔

''آپ سو جائیں، مجھے جب نیند آئے گی، سو جاؤں گی۔''

''شاید مجھ سے خوفزدہ ہو۔ فی الحال ایسے کسی خوف کو دل میں جگہ نہ دو۔ شاباش، سو جاؤ۔ ابھی آگے لمبا سفر کرنا ہے۔ نیند پوری نہ ہوئی تو طبیعت پر کسلمندی چھائی رہے گی۔''

اس وقت اُس کا لہجہ بہت پُرخلوص اور مکاری سے پاک تھا۔

''آپ مجھے گھر چھوڑ دیں۔ میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' اُسے انسانیت کے لبادے میں دیکھ کر خضری ممنونیت سے بولی کہ جان چکی تھی وہ اکڑ اور

دھونس سے کبھی کوئی بات نہیں مانے گا چاہے اس میں اپنا کتنا ہی نقصان کر بیٹھے۔ سو اُسے راہِ راست پر لانے کی خاطر اس نے اپنے رویئے میں تبدیلی ناگزیر سمجھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ مگر یاد رکھنا، احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔''

گاؤں کی صبح بہت خوب صورت تھی۔

فرائی انڈوں اور دیسی گھی سے تر بتر پراٹھوں سے ناشتہ کیا گیا۔ شانزل ان ماں بیٹے سے بہت گھل مل گیا تھا۔ حالات اُس کے موافق ہوتے تو وہ بھی ان کے خلوص و مروت کا اظہار زور و شور سے کرتی۔ اس وقت تو صرف دل ہی دل میں معترف تھی۔

ناشتے کے بعد منور کی ماں نے دو بار انہیں چائے بنا کر دی تھی۔ چائے عمدہ تھی۔ شانزل کی تعریف کے جواب میں بولی۔

''منور شہر پڑھنے گیا تو یہ لت لگا کر لایا۔ اب تو میں بھی چائے کی عادی ہوگئی ہوں۔ ان دنوں چھٹیوں میں منور گھر آیا ہوا ہے۔''

اس کی سنجیدگی اور خاموشی کو منور نے بوریت سے تعبیر کیا تھا، سو اُسے بہلانے کے لئے بہت سے رسالے لا کر دیئے تھے۔ وہ ان سے کچھ دور بیٹھی رسالے دیکھ رہی تھی۔ بلا ارادہ اُس کی نگاہ سامنے اٹھی تو منور کی ماں بڑی ترس کھاتی، ہمدردانہ نظروں سے اس کی جانب گاہے بگاہے دیکھ رہی تھی اور شانزل خان ان سے باتیں کرتے ہوئے بہت فکرمند و رنجیدہ لگ رہا تھا۔ نہ معلوم اُسے اس کا یہ انداز از حد معنی خیز و پراسرار کیوں لگ رہا تھا۔

''آپ شہر سے آئی ہو، یہاں دل تو نہیں لگ رہا ہوگا۔'' شانزل منور کے ساتھ باہر نکلا تو وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ گاؤں شہر کے مقابلے میں بہت پُرسکون جگہ ہے۔'' رسالے ایک طرف رکھ کر وہ قصداً مسکرا کر گویا ہوئی۔

''پھر اتنی خاموش اور پریشان کیوں لگ رہی ہو؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اس طرح الگ تھلگ، خاموش رہو گی تو طبیعت بہلنے کی بجائے مزید خراب ہو گی۔ دیکھو بی بی! عمر میں، میں آپ سے بہت بڑی ہوں اور حیثیت تو خاک کے ذرے کے برابر بھی نہیں ہے، لیکن برا نہیں مانو تو کچھ باتیں بھلائی کی ضرور بتاؤں گی۔ اس دور میں کوئی بھی مرد اتنا بلند حوصلہ و ہمت نہیں رکھتا جتنا میں شانزل صاحب میں دیکھ رہی ہوں۔ عورت تو مرد کے تیور و مزاج دیکھ کر چلتی ہے، پھر بھی اتنی عزت نہیں پاتی۔ بہت اچھی قسمت والی ہو آپ بی بی! جو ایسا خیال رکھنے والا، چاہنے والا گھر والا ملا ہے۔''

''گھر والا؟'' اُس نے حیرانی سے ان کے لفظوں پر غور کیا۔

''میں بھی دیکھ رہی ہوں، کل سے آپ نے ابھی تک ان سے کوئی بات نہیں کی ہے۔ دور دور، اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہیں۔ ایسا نہیں کرتے۔ مرد تو سر کا سائیں ہوتا ہے۔ مضبوط پناہ گاہ ہوتا ہے اور ان جیسا چاہنے والا تو......''

''کس نے کہا؟ کس نے کہا وہ میرا کچھ لگتا ہے؟'' وہ ایک دم ہی اس کی بات قطع کر کے کھڑی ہوگئی۔ اُس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی نے کھولتے تیل میں پانی ڈال دیا ہو۔ غصے اور جنون سے چہرہ سرخ و جسم لرزنے لگا تھا۔

''نہ... ناراض نہ ہو بی بی! مجھے صاحب نے ہی بتایا ہے۔'' منور کی ماں بری طرح سہم گئی۔

''وہ...... وہ ذلیل کمینہ انسان میرا کچھ نہیں لگتا۔ آوارہ، بدمعاش، مجھے میری مرضی کے بغیر اغوا کر کے لایا ہے۔ میرا کوئی رشتہ نہیں اس سے۔'' ابھی نا معلوم کیا کیا وہ اسے کہتی کہ لمحے بھر میں وہ اندر داخل ہو کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بڑے افسردہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

''میں نے کہا تھا نا آپ سے ماں جی، انہیں دماغی دورے بھی پڑتے ہیں اور اس دوران میں یہ ایسی ہی باتیں کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ مجھے گالیاں بکنے سے بھی نہیں چوکتیں۔'' خضریٰ کوشش کے باوجود بھی اس کے ہاتھ کی سخت گرفت سے اپنے ہونٹوں کو آزاد نہ

کر پائی۔ مستزاد شانزل کا اداکاری سے بھرپور لہجہ اور ماں جی کی رحم زدہ نگاہیں۔ اس لمحے سچ مچ اس کا دل شانزل کو قتل کرنے کو مچلنے لگا۔

''دعا کروں گی، اللہ آپ کی اس مصیبت کو اپنے کرم سے دور کرے۔ آہ..... ہا! بھلا کوئی کہہ سکتا ہے اس قدر پیاری لڑکی ایسے موذی مرض میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ یہ سب اوپر والے کے کھیل ہیں۔ خیر وہی مشکل آسان کرے گا۔''

''اگر ایک گلاس ٹھنڈا پانی مل جائے تو......''

''میں لاتی ہوں ابھی۔'' منور کی ماں پھرتی سے دروازے سے باہر نکل گئی تو شانزل نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا اور اس کے بپھرے انداز کو نظر انداز کر کے بولا۔

''کچھ کہنے سے پہلے عقل بھی ذرا استعمال کرلیا کرو۔''

''آپ کو جرأت کیسے ہوئی یہ سب بکواس کرنے کی؟'' وہ بالکل آؤٹ آف کنٹرول تھی اس وقت۔

''مصلحت کے تحت کبھی ایسی بکواس کرنی پڑ جاتی ہے مائی ڈیئر! یہ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ ماں باپ، بہن بھائی یا میاں بیوی کے علاوہ کسی چوتھے رشتے کو فحاشی و بدکاری کے زمرے میں دیکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کی پرچھائیوں سے بھی کراہت محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں، میں نے دانش مندی سے سوچ سمجھ کر جھوٹ بولا تھا کہ اس طرح ان کی نگاہوں میں ہم دونوں کی عزت برقرار رہے۔ اگر میں تمہارے مزاج کو جانتے ہوئے یہ نہ کہتا کہ تم دماغی مریضہ ہو تو اس وقت ان کی نگاہوں سے جھلکنے والا ترس اور ہمدردی نفرت وحقارت میں بدل چکی ہوتی۔ میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی عزت ووقار سے محروم کر چکی ہوتیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینا چاہئے۔''

منور کی ماں کو جگ میں پانی لاتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تو اسے بھی احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

گاؤں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پٹرول پمپ تھا۔ منور سائیکل پر جا کر

پٹرول لے آیا۔

پھر واپسی کے سفر تک خضریٰ کا موڈ درست نہیں ہوا تھا۔ منور کی ماں نے بہت دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے کافی دور تک چھوڑنے بھی آئے تھے۔

کار کا سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ خضریٰ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ شانزل نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا بھی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ گویا بالکل بیگانہ ولاتعلق بنی ہوئی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ موسم ابر آلود ہونے کے باعث فضاؤں میں خنکی و خوشگواریت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھیلا چاول کے کھیتوں کا سلسلہ دلکش لگ رہا تھا۔

''ناراض ہو؟ مجھے اپنے سے زیادہ تمہارا اور تمہاری عزت ووقار کا خیال تھا ورنہ مجھے ضرورت نہیں تھی یہ جھوٹ بولنے کی۔'' اُس نے گویا اُسے بولنے پر اکسایا۔

''کہاں جا رہے ہیں اب آپ؟'' وہ اُس کی صفائی نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

''گھر، یعنی کراچی۔''

''سچ؟ آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے نا؟''

''نہیں۔ آپ نے کہا تھا، احسان کروں۔ پہلے میں آپ پر احسان کروں گا، آپ کو کراچی واپس لے جا کر۔ پھر آپ احسان کریں گی مجھ پر، کچھ وقت میرے ساتھ گزار کر۔ احسان کا بدلہ احسان ہے اور بدلہ جتنا جلد اتار دیا جائے یہی بہترین عمل ہے۔'' شرافت سے بات کرتا کرتا وہ بالآخر اپنی کمینی خصلت پر آ گیا تھا۔

''اس احسان کا بدلہ ایسا اتاروں گی کہ آپ تاحیات یاد رکھیں گے کہ کس سے واسطہ پڑا تھا آپ کا۔'' وہ دانت بھینچ کر معنی خیز لہجے میں کہہ اٹھی۔

''اوہ..... گڈ! تو آپ مجھے کمپنی دینے پر راضی ہو گئیں؟'' وہ مسرت سے جھوم اٹھا۔

''ہاں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔'' وہ جبراً مسکرائی۔

''تھینکس..... تھینکس مائی سویٹ ہارٹ! میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ میری

ہارٹ فیلنگ کا انداز نہیں کر سکتی ہو۔'' وہ گنگناتے ہوئے کار دوڑانے لگا۔ خضریٰ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

صبح سے چھایا ہوا ابر آہستہ آہستہ سیاہ گھٹاؤں کا روپ اختیار کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہواؤں میں شدت آنے لگی تھی۔ گھرے ابر کے باعث ماحول میں تاریکی اور وحشت اُترنے لگی تھی۔

''مجھے لگ رہا ہے طوفان آنے والا ہے۔'' ایک دم پھیلتے حبس اور سناٹوں کو دیکھ کر وہ گھبرا کر بولی۔

''اس کو تو آنا ہی ہے۔''

''شٹ اپ۔ میں کیا کہہ رہی ہوں، آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟''

''جذبات ومحبت کے طوفان کی بات کر رہی ہیں نا آپ؟'' وہ معصومیت سے بولا۔

''کبھی تو اپنے نفس سے ہٹ کر بھی بات کر لیا کریں۔'' وہ بری طرح چڑ گئی۔

''اندر کے طوفان سے زیادہ طاقت ور کوئی بھی طوفان نہیں ہوتا۔''

''ہونہہ..... آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔''

''گھبراؤ نہیں۔ ہم کراچی دو یا تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے طوفان تو یہاں آتے رہتے ہیں جو جلد ختم ہو جاتے ہیں۔'' اسے پریشان اور فکر مند دیکھ کر اس نے اپنائیت سے تسلی دی۔

خضریٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر حبس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب سڑک کے دونوں جانب باغات تھے جہاں کثرت سے آم درختوں پر لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہرے، پیلے، سرخ آم خوبصورت لگ رہے تھے۔

موسم کی تبدیلی وہ بہت دیر سے محسوس کر رہا تھا اور حالات کے پیش نظر ہی نہایت رش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ حبس اور وحشت بھری پراسراریت بتا دے رہی تھی کہ زبردست طوفان آنے والا ہے اور وہ اس سے قبل کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ یہاں بہت وسیع رقبے پر آم کے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ آبادی تھی لیکن نہایت مختصر۔

فاصلے پر کچے پکے گھر بنے ہوئے تھے۔ آگے کی جانب اسے ایک چھوٹی لیکن ریسٹ ہاؤس ٹائپ کی بنی ہوئی پکی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کی کوشش جلد از جلد اس تک پہنچنے کی تھی۔

جب وہ اس تک پہنچا تو ایک دم ہی ماحول میں پھیلا حبس اور سناٹا ٹوٹ گیا۔ ہوائیں مست ہاتھیوں کے انداز میں چیختی، چنگھاڑتی ہوئی ہر شے کو اپنی گرفت میں جکڑنے لگیں۔ ہر طرف گرد وغبار پھیل گیا تھا۔

شانزل نے سیاہ گیٹ کے پاس کار روکی تھی۔ اس کے برابر میں چائے کا ہوٹل تھا۔ ہوٹل کا مالک انہیں پہلے ہی دیکھ چکا تھا، سو کار رُکتے ہی دوڑا ہوا آیا۔ ہوا کی زد سے بچنے کے لئے اس نے دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

''اندر آ جائیے صاحب! اندر آ جائیے۔ بڑی زوروں کا طوفان ہے۔ اللہ رحم کرے۔''

اس کے ہمراہ وہ اس ہوٹل میں آ گئے جو ایک بڑے سے ہال پر مشتمل تھا۔ سامنے کاؤنٹر پر شیشے کی چوکور برنیوں میں کیک، باقر خانیاں اور زیرے کے بسکٹ رکھے نظر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی چائے کے مگ اور پلاسٹک کے جگ گلاس رکھے تھے۔ کاؤنٹر کے نیچے شاید چولہا بنا ہوا تھا کیونکہ وہ دیوار پوری دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھی۔ ہال کے ایک سائیڈ لکڑی کی میز کرسیاں پڑی تھیں۔ اندر ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

وہ سب طرف کا جائزہ لیتی ہوئی اس کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' شانزل اس آدمی سے مخاطب ہوا۔

''رجب علی ہے میرا نام صاحب۔''

''اچھا نام ہے۔ رجب علی! کوئی گاہک نہیں ہے یہاں؟ کوئی چائے پینے آیا نہیں یا طوفان سے ڈر کر بھاگ گیا؟'' شانزل مسکرا کر پوچھنے لگا۔

''اللہ کا بہت کرم ہے صاحب مجھ گناہگار پر۔ صبح شام گاہکوں سے مجھے فرصت نہیں ہوتی۔ دولڑکے بھی میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس وقت طوفان کی وجہ سے سب چلے

گئے ہیں۔'' رجب علی نے سادگی سے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔

''ایسے طوفان یہاں اکثر آتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی آتے ہیں؟'' شانزل نے کھڑکی سے باہر گرد آلود منظر دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''اس موسم میں اکثر آتے رہتے ہیں۔''

''اس طرح تو فصلوں کا بڑا نقصان ہو جاتا ہوگا؟''

''ہاں صاحب، بس کیا کریں، سب اوپر والے کی مرضی ہے۔''

''کتنی دیر تک رہتا ہے ایسا طوفان؟'' خضریٰ نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''ان کی کیا ڈائریکٹ ''اوپر'' سے لائن ملی ہوئی ہے جو انہیں وقت کے تعین پر گرفت حاصل ہو؟'' شانزل ہنس کر گویا ہوا۔ اس کے تمسخرانہ انداز پر خضریٰ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ وہ ایک نگاہ برہم سی ڈال کر رہ گئی۔ جبکہ رجب علی کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی لیکن اسے پُرسکون، مطمئن اور بے خوفی سے ہنستے دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

''اتنا زبردست طوفان ہے، آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟''

''میری زندگی میں اس سے زیادہ بھیانک اور خطرناک طوفان آتے رہتے ہیں۔ عادی ہو گیا ہوں خطروں سے گزرنے کا۔'' وہ گہری نگاہوں سے خضریٰ کی جانب دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ اس بار اس دیہاتی کی شاید ہمت نہ ہوئی مزید سوال کرنے کی کہ وہ ذو معنی بات کر رہا تھا جو اس سادہ ذہن کے بندے کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

''ریسٹ ہاؤس کی چابیاں کس کے پاس ہوتی ہیں؟''

''ریسٹ ہاؤس کی چابیاں چھوٹے سائیں کے پاس ہوتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی آتے ہیں جب زمینوں کا کوئی معاملہ ہو جاتا ہے۔ اس کی صفائی، ستھرائی کے لئے بندے آتے ہیں ایک دو ہفتوں میں۔ بڑے سائیں سال میں ایک مرتبہ آتے ہیں۔'' رجب علی نے حسب عادت پوری تفصیل بیان کی۔

''تمہیں یہاں ہوٹل کھولنے کی اجازت کیسے مل گئی؟''

''ایک مرتبہ یہاں چوری ہو گئی تھی۔ بڑے سائیں کو کسی چوکیدار کی ضرورت تھی۔

مجھے معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ سائیں میں یہاں چائے کا ہوٹل کھول لیتا ہوں، اس طرح یہاں سارے دن رونق رہے گی۔ رات کو میں یہیں رک جایا کروں گا۔ سائیں کو یہ مشورہ پسند آ گیا۔ اس طرح میں نے یہاں ہوٹل کھول لیا اور اوپر والے کے فضل و کرم سے ہوٹل خوب چل نکلا۔''

''تمہارا گھر بار نہیں ہے؟'' شانزل کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

''گھر بار کیسا صاحب۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوا۔ ''ماں باپ بہت پہلے دنیا چھوڑ گئے تھے۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ مجھ سے چھوٹی چار بہنیں اور تین بھائی تھے۔ جیسے تیسے کر کے انہیں پالا، شادیاں کیں۔ اب بہنیں اپنے گھروں میں خوش ہیں اور بھائی اپنے بیوی بچوں میں مگن ہیں۔ سب ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔ سال چھ مہینے میں کچھ دنوں کے لئے جاتا ہوں، جو کچھ جمع کرتا ہوں بانٹ آتا ہوں۔''

''تم نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''اس عمر میں کون مجھے بیٹی دے گا صاحب۔ جب عمر تھی تو فرائض اور ذمہ داریوں کے احساس نے کبھی اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔''

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا۔'' خضریٰ کو اس پر ترس آ گیا۔ وہ بولی تو شانزل اس کی بات قطع کر کے بولا۔

''ہاں، جیب میں نوٹ ہونے چاہئیں۔ بہت لڑکیاں مل جاتی ہیں۔''

''جی نہیں۔ ایک شریک حیات کافی ہوتی ہے مرد کے لئے جو شوہر کو گھر کا آرام و سکون دے۔ شریف و عزت دار مرد کی زندگی میں ایک عورت آتی ہے بیوی بن کر جس کی خوشی شوہر کی خدمت میں اور سکون اس کی وفا میں ہوتا ہے۔ حیرت ہے بھائی، بہن جیسے مقدس اور انمول رشتے بھی اب خود غرضی، مفاد پرستی کے اندھیروں میں گم ہو چکے ہیں ورنہ انہیں خود احساس ہونا چاہئے آپ کا۔'' خضریٰ کے لہجے میں ہمدردی محسوس کر کے رجب علی خاصا متاثر ہوا تھا۔

"چائے وائے بھی پلاؤ گے رجب علی یا باتوں سے ہی......"

"کیوں نہیں صاحب، ابھی دودھ پتی بنا کر لاتا ہوں۔" وہ بہت جوش سے اٹھا اور چولہا جلانے لگا۔

باہر ایک دم ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں جس سے ہوا کے طوفان میں کمی واقع ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے زبردست بارش شروع ہو گئی تھی۔

"اُف...... بہت تیز بارش ہے۔ اب نہ معلوم کب یہ رکے۔" خضریٰ نے کھڑکی سے جھانکا تو کچھ دور کھڑے شازل سے پریشانی سے بولی۔

"کیا حرج ہے اگر نہ بھی رکے تو۔" اس نے دلچسپ نگاہوں سے اس کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"سنا ہے اس برسات کے موسم میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ روٹھے ہوئے کو قریب لے آتی ہے۔ دو قلب کو ایک جاں کر دیتی ہے۔" اُس کی آواز خمار آلود تھی۔

"اپنی حد میں رہیں آپ۔" وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر گویا ہوئی۔

لفظ چھن جائیں فقط منہ میں زبان رہ جائے
جس طرح تیر چلے اور کماں رہ جائے
آؤ، دو چار گھڑی بیٹھ کر دکھ سکھ باتیں
جانے اس بھیڑ میں پھر کون کہاں رہ جائے

بہت گمبھیر لہجے میں شازل نے اشعار پڑھے تھے۔

"صاحب! چائے کے ساتھ پیسٹری، بسکٹ وغیرہ کچھ لیں گے؟" رجب میز پر چائے رکھتا ہوا پوچھنے لگا۔ دونوں نے ہی منع کر دیا تھا۔

چائے کے دوران دونوں کی گفتگو جاری رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کپ لے کر کھڑکی کے قریب آ گئی تھی۔ باہر بارش سے جل تھل ہو رہی تھی۔ گہرے بادل جن کی وجہ سے اندھیرا سا پھیل گیا تھا ان کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ جلد قابو آنے والے نہیں ہیں۔ اس کے اندر تک سناٹا پھیلتا چلا گیا۔ بارش کا موسم ویسے بھی اپنے اندر بہت ساری اداسیاں

اور یادیں لایا کرتا ہے۔ اس وجہ سے اسے یہ موسم پسند نہیں تھا۔ اس سے بھی ابا بی کی یاد دل میں چٹکیاں سی لینے لگی تھی۔ وہ اس کی پریشانی سے بے خبر یہ سوچ کر مطمئن ہوں گی کہ وہ ثانیہ کی شادی انجوائے کر رہی ہے۔

"اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں یہاں اس وحشی بھیڑیے کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہوں تو کیا ہوگا؟ جس شخص کی پرچھائیں سے بھی میں گریزاں تھی، آج اس کے ساتھ ہوں تو کیا ہوگا؟ وہ اس حقیقت کو برداشت کر پائیں گی؟ شاید نہیں۔ نہیں...... میں کسی صدمے کو برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ امی جان کو کھونے کے بعد ابا بی کی جدائی ہرگز برداشت نہیں ہوگی۔" اس نے گھبرا کر سوچا۔

موسم نے نئی کروٹ بدلی اور بارش میں شدت کے ساتھ ساتھ آسمان پر گرج چمک بھی زور شور سے شروع ہو گئی۔

واپسی کے سارے راستے بند ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بے جان ہوتے جسم کو گھسیٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

رجب علی لالٹین صاف کر کے جلا رہا تھا کیونکہ کمرے میں خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ لالٹین جلی تو مٹی کے تیل کی ناگوار بو اور چمنی سے نکلنے والے زرد اجالوں نے ماحول کو کسی آسیب زدہ ویرانے کا حصہ بنا ڈالا تھا۔ مدھم ناتواں روشنی نے وہاں رکھی اشیاء کے سائے بھی لمبے کر دیئے تھے۔ خود رجب علی کا سایہ دیوار سے اونچا جا رہا تھا۔

وہ پریشان سی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اتنا نحوست بھرا اور وحشت زدہ ماحول تھا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے اٹھ کر باہر بھاگ جائے۔ اتنی دور کہ کوئی ڈھونڈنے کے باوجود بھی نہ ڈھونڈ پائے۔

رجب علی بکھیڑا سمیٹتا پھر رہا تھا۔ شازل نا معلوم سو گیا تھا یا یونہی چہرے پر ہاتھ رکھے دوسری کرسی پر پاؤں پھیلائے آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

اندر صرف بادلوں کے گرجنے اور بارش کی آوازیں تھیں۔

شازل اور رجب علی کے درمیان شاید باتوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا۔

"آپ لوگوں کو چائے بنا کر دوں؟" شاید اس نے بھی اس وحشت ناک خاموشی کو توڑنے کی غرض سے پوچھا۔

"نہیں یار! ایک تو پہلے ہی بن بلائے مہمان بن کر تم پر نازل ہو چکے ہیں۔ اب اگر اس طرح فرمائشیں کریں گے تو کہیں اس ٹھکانے سے بھی محروم نہ ہونا پڑ جائے۔" شانزل آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر سیدھا بیٹھتا ہوا مسکرا کر بولا۔

"نہیں، نہیں صاحب۔ ایسا بھلا کس طرح ہو سکتا ہے۔ بہت عرصے بعد لگ رہا ہے میں اپنوں کے درمیان ہوں۔ اب تو آپ کو چائے پینی پڑے گی۔" رجب علی جوش سے بولا اور تازہ چائے بنانے لگا۔

"پلا دو یار! اتنی محبت سے کوئی زہر بھی پلائے تو پی لینا چاہئے۔"

"جو محبت کرتے ہیں وہ زہر کہاں پلاتے ہیں صاحب۔"

"واہ! تم نے کبھی محبت کی ہے رجب علی؟"

"ہاں۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں سے اور ان کے بچوں سے بہت محبت ہے بلکہ بہنوں میں تو میری روح بستی ہے۔"

"اس کے علاوہ کسی لڑکی سے محبت نہیں ہوئی؟" وہ ہنس کر بولا۔

"نہیں۔ وقت ہی نہیں ملا کبھی۔" رجب علی اس قدر شرما کر بولا کہ شانزل کوشش کے باوجود اپنے قہقہوں پر قابو نہ رکھ سکا۔

"مسٹر شانزل خان آفریدی! گھٹیا گفتگو کرنے سے قبل یہ بھی دیکھو کہ تمہارے درمیان ایک تیسری ہستی بھی موجود ہے جو تمہاری صنف سے تعلق نہیں رکھتی۔ مہربانی فرما کر اپنی زبان کو شرافت و اخلاقیات کے دائرے میں لاؤ۔"

اسے پٹری سے اترتے دیکھ کر خضری، رجب علی کے خیال سے انگلش میں گویا ہوئی۔ اسی لمحے رجب علی چائے ان دونوں کے آگے رکھ چکا تھا۔ شانزل نے مسکراتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

"وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ یہاں ایسا کوئی راستہ ہے رجب علی جس کے

ذریعے ہم کراچی جا سکیں؟" چائے کے سپ لیتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے سے سنجیدگی جھلکنے لگی تھی۔

"یہاں جتنے بھی راستے ہیں وہ اب دریا بن چکے ہوں گے اور ایسے میں گاڑی چلانا بہت خطرناک ہے۔ آپ صبح تک رُک جائیں۔ بارش بند ہو تو آپ چلے جایئے گا۔" رجب علی نے خلوص سے مشورہ دیا۔

"نہیں، ہم رات یہاں کیسے رُک سکتے ہیں؟" وہ سخت متوحش ہوئی۔

"مجبوری ہے جی۔ دیکھیں نا بارش کتنی زوروں کی پڑ رہی ہے۔ رات بھی ہو گئی ہے اور راستے ویسے بھی جانے پہچانے نہیں ہیں آپ کے۔"

"تمہاری بات درست ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ رات اس طرح کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے نہیں گزر سکتی۔ کہاں رہیں گے ہم لوگ؟"

"ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے کی چابی ہے میرے پاس۔ عام حالات میں، میں کبھی یہ چابی کسی کو نہیں دیتا۔ کیونکہ بڑے سائیں نے مجھ سے یہ عہد لے کر چابی دی تھی کہ اس کمرے کو میں تبھی استعمال کروں گا جب میرے گھر والے مجھ سے ملنے آئیں گے۔ یعنی میں مستقل اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا تو جب بھی کوئی بہن، بھائی ملنے آتا ہے تو میں وہ کمرہ استعمال کرتا ہوں۔ اس وقت آپ لوگ بھی مجھے اپنے سگوں کی طرح ہی لگ رہے ہیں تو میں وہ چابی آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ لوگ وہاں رک جائیں۔"

"بہت بہت شکریہ یار! تم نے بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ لیکن تم کہاں سوتے ہو؟" اس سے چابی لیتے ہوئے شانزل نے استفسار کیا۔

"برابر بیٹھک میں میرا پلنگ پڑا ہے، میں وہیں سوتا ہوں۔"

"تھینکس گاڈ! یہ بڑا مسئلہ تو حل ہوا۔ چلو تم بہت تھک گئی ہو، ذرا آرام کر لو۔ صبح دیکھیں گے کیا صورت حال ہوتی ہے۔"

وہ چابی لے کر اس کے نزدیک آ کر کہنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی

سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ رجب علی کے ہمراہ طویل راستہ عبور کر کے وہ کمرے میں پہنچے جو اوپر واقع تھا۔ فرش پر وائٹ چاندنی بچھی ہوئی تھیں اور دیواروں کے سہارے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے اور ایک طرف کھیس رکھے نظر آ رہے تھے۔ رجب علی نے لالٹین ایک مخصوص جگہ پر رکھ دی تھی۔

''کمرہ تو بہت صاف ستھرا ہے۔'' شانزل نے جائزہ لے کر رجب علی سے کہا۔

''میں روزانہ صفائی کرتا ہوں یہاں کی۔ اب جی آپ آرام کرو۔ میں کھانے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''میں بھی آ رہا ہوں، تمہیں تنہائی میں ڈر تو نہیں لگے گا؟'' شانزل بولا۔

''نہیں۔'' اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور چپل اتار کر چاندنی پر بیٹھ گئی۔ رجب علی کے جانے کے بعد شانزل بھی چلا گیا تو کچھ دیر وہ ماؤف ذہن کے ساتھ لالٹین سے نکلنے والی زرد روشنی کو دیکھتی رہی۔ وہ ایک کے بعد ایک نئی مشکل کا شکار ہو رہی تھی۔ ان مشکلات و حادثات سے فرار کہاں ممکن تھا اس کے لئے۔

شانزل کو گئے خاصی دیر گزر چکی تھی۔ ایک ہی زاویئے سے بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ گاؤ تکیہ گھسیٹ کر کچھ دیر بعد اٹھنے کا ارادہ کر کے لیٹ گئی۔

باہر بارش کی حشر سامانیاں جاری تھیں۔ گرج چمک میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی۔ ساری تھکاوٹ اور بے سکونی نیند بن کر اس پر غالب آنے لگی۔ اس کا سونے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، شانزل کی نگاہوں میں چمک بڑھتی جا رہی ہے اور وہ اسے کوئی موقع فائدہ اٹھانے کا فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی دیر تک نیند بھگانے کے لئے جدوجہد کرتی رہی، لیکن کب تک؟ نیند سے بھی کوئی جیت سکا ہے؟ کسی کمزور لمحے میں نیند اُس پر قابو پا چکی تھی۔ وہ اردگرد سے بے خبر سو رہی تھی۔

اچانک ہی دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا تھا..... آواز اتنی شدید تھی کہ وہ جو نہ معلوم کب سے بے خبر سو رہی تھی، گھبرا کر بیدار ہو گئی۔

آنکھیں کھولنے کے بعد متوحش انداز میں اس نے لیٹے لیٹے ہی گردن اِدھر اُدھر گھمائی۔ لالٹین سے نکلتی زرد روشنی غائب تھی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ باہر بارش طوفانی شدت اختیار کر گئی تھی۔

معاً اُسے وہاں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا اور احساس ہوتے ہی اس کے ذہن میں چھناکا ہوا تھا۔ ''آہ..... میں کیوں سوئی؟'' اُس نے وحشت زدہ ہو کر اٹھنا چاہا۔

''کیا ہوا؟'' اندھیرے میں شانزل کی آواز بہت قریب سے اُبھری تھی.....!

❋☆❋

''ڈر گئیں ؟ دور کہیں بجلی گری ہے۔'' اسی دم بجلی بھرپور انداز میں چمکی تھی۔ اس نے دیکھا، وہ گھٹنوں کے بل اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پوری طاقت سے اسے دور دھکیلا۔ اس کے لئے خضریٰ کی یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ بے اختیار گرا تھا۔

''ارے کیا ہوا؟ یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ سخت حیرانی سے گویا ہوا۔

''ذلیل انسان! میری نیند سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے؟ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔''

آخر کار وہ وقت آن پہنچا تھا جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ جس کی خاطر اس نے ہر طریقے سے راہ ہموار کی تھی اور اب کامیاب ہوا چاہتا تھا۔ اس لمحے اس نے اپنے عزم کو دہرایا تھا کہ آبرو باختہ لڑکی کی حیثیت سے ایک فاحشہ کی طرح زندگی گزارے گی یا عزت دار موت کو گلے لگائے گی کیونکہ اس مضبوط مرد سے مقابلہ کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

''خضریٰ! گھبراؤ نہیں، کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔'' اُسے سخت وحشت و جنون کی حالت میں کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ پریشانی سے گویا ہوا۔

''لالٹین کیوں بجھائی تم نے؟ میری تنہائی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟ مجھے کمزور اور بے بس سمجھتے ہو؟ اونہہ، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تم نے ابھی تک دولت پر سب کچھ لٹا دینے والی لڑکیاں دیکھی ہیں مگر ایسی لڑکیاں نہیں دیکھیں جو گھریلو مجبوریوں کے باعث تم جیسے ہوس پرستوں کی ملازمتیں تو کرتی ہیں مگر کسی قیمت پر عصمت فروخت نہیں کرتیں۔''

''اسٹوپڈ نہیں بنو خضریٰ! خدا کے لئے میری بات سنو، تم غلط سمجھ رہی ہو۔ شاید لالٹین میں تیل ختم ہو گیا ہے۔ اسی لئے بجھ گئی ہے۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''قریب مت آؤ...... قریب مت آؤ۔'' اُسے آگے بڑھتے دیکھ کر وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی تھی۔ شانزل ایک جست میں اُس کے قریب پہنچا تھا اور تیزی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر غرایا۔

''پاگل نہیں بنو۔ نیچے آواز جائے گی تو رجب علی کیا سوچے گا۔'' لیکن اس وقت وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ جیسے ہی اُس نے منہ سے ہاتھ ہٹایا، دونوں ہاتھوں سے اُس کے چہرے پر حملہ کر دیا تھا۔

''کیا کر رہی ہو؟ اوہ...... اسٹوپڈ گرل۔'' وہ گھبرا کر دور ہٹا تھا۔ اتنی دیر میں اندھیرے سے آنکھیں مانوس ہو گئی تھیں۔ خضریٰ کے ناخنوں نے اس کے چہرے پر خراشیں ڈال دی تھیں جن میں جلن محسوس ہونے لگی تھی۔

''بات سنو میری...... پاگل مت بنو۔'' اس وقت خضریٰ بالکل ہوش و حواس سے بیگانہ نظر آ رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کسی بھی لمحے وہ خود کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

''میں تمہیں تمہارے گھٹیا ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔''

اُس نے شیشے کا گلاس اٹھا کر پھرتی سے دیوار پر مار کر توڑا اور قریب تھا ٹوٹے گلاس سے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لیتی، شانزل نے ہاتھ پکڑ کر وہ ٹوٹا گلاس نیچے پھینکا اور شدید غصے سے بھرپور تھپڑ اس کے رخسار پر مارا۔

''اسٹوپڈ، جان دینا چاہتی ہو؟ حد ہوتی ہے بدگمانی اور احمقانہ پن کی۔ تمہاری محدود عقل میں جو بات پہلے دن سے سمائی ہے اسی سوچ میں ہر وقت، ہر لمحہ گم رہتی ہو۔ اگر مجھے تمہیں اسی طرح حاصل کرنا ہوتا تو کیوں خواہ مخواہ دو دن اور تین راتیں خوار ہوتا؟'' اُس کے غصے میں کمی نہیں ہوئی تھی، بری طرح لہجہ درشت تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہیں اس طرح لانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تمہاری طویل بے ہوشی کے باعث مجبوراً لانا پڑا کہ وہاں دشمنوں میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مگر

تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا، ابھی تک یہی سمجھ رہی ہو کہ میں اغوا کر کے لایا ہوں اور موقع دیکھ کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سوچو، کچھ عقل کو بھی استعمال میں لاؤ۔ اگر مجھے یہی سب کرنا ہوتا تو مجھے وہاں وجاہت سومرو کی حویلی میں کیا قباحت تھی؟ کون میرا راستہ روک سکتا تھا وہاں۔ تم جو دروازہ اندر سے لاک کر کے سمجھ رہی تھیں کہ اب کوئی اندر نہیں آ سکتا تو یاد رکھنا، ایسی جگہوں پر بہت سے خفیہ دروازے ہوتے ہیں۔ میں کسی دروازے سے بھی اندر آ سکتا تھا اگر مجھے یہی سب کرنا ہوتا۔ بہت سے مواقع تھے مگر میں کبھی مجبوریاں نہیں خریدتا۔ کھرا اور صاف ستھرا سودا پسند کرتا ہوں، لٹیرا نہیں ہوں۔''

وہ چند لمحے خاموش ہوا، نیچے گرا ہوا اُس کا دوپٹہ اُٹھا کر اس کے ساکت و صامت وجود پر ڈال دیا۔ کمرے میں ایسی ہی خاموشی چھا گئی جو طوفان کے بعد چھاتی ہے۔ خضریٰ گھٹنوں میں منہ چھپائے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ کبھی کوئی تیز سسکی فضا میں گونج اُٹھتی تھیں۔ باہر بارش مسلسل ہو رہی تھی۔

''کب تک رونے کا ارادہ ہے؟ میں نے فرنچ آملیٹ بنائے تھے گرم گرم، یہاں ڈنر بھیجا تھا۔ رجب علی لے کر آیا تو تم سو رہی تھیں۔ اس سے باتوں میں کافی وقت گزر گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ تم بھوکی ہو۔ یہاں آیا تو کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اسی دم باہر کہیں بجلی گری تھی۔ تم چیخ کر اٹھ بیٹھیں، میں سمجھا تم نیند سے بیدار ہونے کے باعث خوفزدہ ہو گئی ہو۔ سو تمہیں تسلی دینے کے لئے تمہاری طرف بڑھا تھا اور تم.....''

اُس نے طویل سانس لے کر بات قطع کر دی۔ ''یقیناً تمہیں میرا یہ سچ بھی کوئی جھوٹی اسٹوری لگ رہا ہوگا۔ کیونکہ میں تمہاری سوچوں سے، طبیعت سے واقف ہو گیا ہوں اور ازحد افسوس ہے تمہاری محدود سوچ اور کم فہمی پر۔ بہت غربت کا شکار ہو اس معاملے میں۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ خضریٰ کی پوزیشن میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''میں باہر گیلری میں ہوں، کھانا کھا لو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اگر چاہو تو اندر سے بند کر

لینا۔'' وہ کہہ کر سیدھا کمرے سے نکل گیا۔

بارش دوسرے دن صبح تک یونہی برستی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ دوپہر تک کم ہوئی تھی۔ شانزل نے بھی فوراً رجب علی کو خدا حافظ کہا تھا۔

بارش بند ہو چکی تھی۔ صرف دھیمی پھوار گر رہی تھی۔ طوفان کے زور سے کئی جگہوں پر درخت کی شاخوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں ٹوٹ کر بکھری ہوئی تھیں۔ بارش کے باعث راستہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ سڑک پر کئی جگہ گڑھے پڑ کر ان میں پانی بھر گیا تھا۔ چکنی مٹی نے سڑک پر پھسلن پیدا کر دی تھی۔ شانزل بہت محتاط انداز میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

رات سے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ عجب سرد مہری و بیگانگی خضریٰ کے رویے میں در آئی تھی۔ شانزل نے بہت کوشش کی اس خاموشی کو توڑنے کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ کار تیزی سے کراچی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔

''تھینکس گاڈ! یہاں کا موسم خراب نہیں ہے۔'' شانزل نے سپر ہائی وے پر کار دوڑاتے ہوئے خضریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ابھی تک ناراض ہو؟ حیرت ہے، آپ اس قدر ضدی و خودسر ہوں گی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں بے قصور ہونے کے باوجود ایکسکیوز کر رہا ہوں پھر بھی آ.....''

''آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ یہاں سے میرا گھر قریب ہے، میں چلی جاؤں گی۔'' کار وائٹ ہال کے قریب سے گزرتے دیکھ کر وہ بولی۔

''گھر تک پہنچا دوں گا۔'' اُس نے اطمینان سے کہا۔

''نہیں، یہ میری عزت اور وقار کا معاملہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔'' وہ تیزی سے دوٹوک لہجے میں کہہ اٹھی۔

''پہلے لنچ کر لیتے ہیں۔ صبح بھی تم نے صرف چائے پی تھی۔''

''نہیں۔ میں صرف گھر جاؤں گی۔''

''اتنی آسانی سے؟''

''اگر اب تم نے میرے لئے کوئی مشکل پیدا کرنے کی کوشش کی تو دیکھ لینا اپنا

انجام بھی۔"

"ہا، ہا...... میری بھی یہی خواہش ہے کہ میرا انجام تمہارے ہاتھوں ہو۔" وہ ہنس کر بولا۔ چند لمحے اس کا جارحانہ تیور دیکھتا رہا پھر ایک سائیڈ میں کار روک دی۔

"جانے سے پہلے وعدہ کر کے جاؤ۔ کب ملو گی؟ آئی مین، احسان کا بدلہ کب اتارنے آؤ گی؟"

"کبھی نہیں، سمجھے؟" اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے غرا کر کہا اور ساتھ ہی قریب سے گزرتے رکشے کو روکا اور سرعت سے کار سے نکل کر رکشے میں بیٹھ گئی۔ شانزل کی جانب اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

شانزل ہونٹ بھینچے رکشے کے پیچھے اُڑتی دھول کو دیکھتا رہ گیا۔

⁕☆⁕

"یا اللہ! میں بچ گئی۔ میں باعصمت واپس آ گئی، آپ کا بہت کرم ہے، بہت احسان ہے یا رب العالمین! مجھ گناہ گار بندی پر بہت بڑا کرم ہے۔" گھر آتے ہی اس نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور جانماز بچھا کر نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب گھر آئی تھی تو انا بی گھر میں نہیں تھی۔ دروازے میں باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ ایسا تب ہوتا تھا جب وہ پڑوس میں گئی ہوتی تھیں۔ اور وہ یہی چاہتی تھی کہ اس وقت انا بی سے اس کا سامنا نہیں ہو کہ کس طرح اپنا بھرم رکھ پائے گی۔ اس وقت تو اس وحشی کے حصار سے باعزت نکل آنا اس کے لئے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

دل و دماغ پر چھایا گزرے وقت کا غبار آنسوؤں کے ذریعے بہہ گیا تو طبیعت ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی اور شدت سے بھوک اور نیند محسوس ہونے لگی۔ کچن میں انا بی، دال چاول پکا کر رکھ گئی تھیں اور ایک ڈش میں آم کا اچار رکھا ہوا تھا۔ اپنا پسندیدہ کھانا دیکھ کر اس کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ کھانا نکالنے سے قبل اس نے چولہے پر چائے کا پانی رکھا، پھر کھانا نکال کر وہیں بیٹھ کر کھانے لگی۔ بھوک کچھ ایسی ہی زوردار لگی ہوئی تھی کہ اس

نے انا بی کی آمد کا بھی انتظار نہیں کیا۔ کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد خمار گندم سر چڑھ کر بولنے لگا تھا اور وہ پلنگ پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی۔

⁕☆⁕

ملازم نے ٹرالی ایک طرف رکھی اور طائرانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

سرمئی کارپٹ پر جگہ جگہ جلی ہوئی سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ بیڈ پر بڑے بے ترتیب انداز میں بے خبر سو رہا تھا۔ عارفین نے جو اس کا خاص ملازم تھا اور اس سے شدید محبت کرتا تھا، بڑی رنجیدگی سے اپنے مالک کی سمت دیکھا تھا۔

وال کلاک کی سوئیاں دس کے ہندسے پر براجمان تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے بھاری پردے ہٹائے تو کمرہ روشنی سے بھر گیا ورنہ دبیز پردوں کے باعث رات کا گمان ہو رہا تھا۔

"صاحب...... صاحب جی......!" اُس نے تھوڑا سا جھک کر مودبانہ لہجے میں اسے کئی آوازیں دیں۔

"ہوں......" اُس نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

"صاحب! اٹھ جایئے۔"

"کیوں؟"

"صبح ہو چکی ہے۔ آپ نے کہا تھا، دس بجے آپ کو جگا دوں۔"

"صبح ہو گئی؟" نیند سے بوجھل پلکیں اس نے بمشکل کھولیں۔

"جی صاحب۔ بڑے صاحب بھی آپ کا کل سے پوچھ رہے ہیں۔ اب تو دفتر چلے گئے۔"

"چائے دو۔ بہت ظالم ہو عارفین یار تم۔ بڑی مشکل سے دو دن بعد نیند مہربان ہوئی تھی۔ تم نے فوراً ہی بھگا دیا۔" اُس نے نیم دراز ہو کر چائے کا مگ پکڑتے ہوئے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں صاحب! اگر آپ مجھے وقت پر اٹھانے کا حکم نہ دیتے تو میں ایسی

گستاخی کبھی نہیں کرتا۔" عارفین گڑبڑا گیا۔

"کوئی بات نہیں، غلطی میری ہے۔ میرے پیچھے کسی کی کالز وغیرہ آئیں؟"

"جی صاحب! جنیفر صاحبہ کی کئی کالز آ چکی ہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔ سویرا صاحبہ، ربیکا صاحبہ، شعوانہ ملک صاحبہ......"

"اچھا، اچھا...... سب ملنا ہی چاہ رہی ہوں گی۔" اُس کے اندر اچانک ہی بے دلی سی عود کر آئی تھی اور وہ عارفین کی بات قطع کر کے گویا ہوا۔ کیونکہ وہ اپنے فرینڈز کی کالز کے متعلق جاننے کا خواہش مند تھا۔ فی الحال تو ان لڑکیوں کی طرف خیال نہ تھا۔

"شہریار صاحب آئے تھے کل۔ وہ چند ہفتوں کے لئے ملک سے باہر گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کچھ دنوں بعد آپ کو خود فون کریں گے۔"

"اوکے، میرا سوٹ نکال دو۔ ناشتہ ہلکا پھلکا تیار کرانا اور ملازمہ کو کہہ کر کمرے کی صفائی کرواؤ۔" وہ چائے کا مگ اسے پکڑا کر بیڈ سے اٹھ گیا۔

"بہتر صاحب!" عارفین وارڈ روب کی جانب بڑھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

☆

"کیا ابھی تک تمہاری تھکن اُتری نہیں بیٹی؟ ایک دن تو تم نے سونے، جاگنے میں گزار دیا۔ میں نے بہت کوشش کی، شادی والے دن آنے کی۔ مگر فاخرہ کی طبیعت اس دن خراب ہوگئی۔ رات کو جا کر وہ فارغ ہوئی، اب کوئی اس کے پاس تھا نہیں، اس پر دو دو بچوں کا ساتھ اور بچے بھی اس قدر تنگ کرنے والے کہ بس پوچھو نہیں۔ بے چاری فاخرہ بری طرح پریشان ہے۔ اس کا میاں پرسوں آیا تو میں اس سے اجازت لے کر آ گئی اور سوچ رہی تھی کہ جا کر تمہیں بھی لے آؤں اور معذرت بھی کر آؤں۔"

انا بی ناشتے کے دوران مسلسل بول رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ بہت اچھا ہوا انا بی کو موقع نہیں ملا ثانیہ کی شادی میں جانے کا۔ ورنہ اسے وہاں موجود نہ پا کر ان کا کیا حال ہوتا؟

"خضری! کیا بات ہے بیٹی، کچھ پریشان ہو؟ جب سے آئی ہو بہت خاموش ہو۔"

معاً ان کو اس کی غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا تو چائے کا مگ ٹرے میں رکھ کر فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔ ان کو فکرمند دیکھ کر وہ ہوش میں آئی کہ یہ کیا کر رہی تھی۔ وہ ان سے اس واقعے کو چھپانے کا سوچ چکی تھی۔ پھر اس طرح کیوں ان کو کچھ بھانپنے کا موقع دے رہی تھی۔ وہ تو ویسے بھی اس کے بارے میں از حد حساس تھیں۔

"نہیں انا بی! بس ایسے ہی سستی سوار ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کیا اور بہت توجہ سے ان کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

انا بی کی گفتگو وہی رسمی سی تھی جو عموماً شادی کے بارے میں کی جاتی ہے کہ سسرال والے کیسے ہیں؟ دولہا کیسا لگ رہا تھا؟ ثانیہ پر دُلہن بن کر بہت روپ آیا ہوگا۔ جہیز میں کیا کیا سامان دیا؟ وہاں سے بری کیسی آئی؟ رخصتی کب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ وہ بہت احتیاط سے اس طرح گول مول جواب دے رہی تھی کہ انا بی کو ذرا بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے اور اسے اپنے آپ پر حیرت تھی کہ کس طرح وہ بہت دلیری و صفائی سے جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی ہے۔ اس سے قبل تو کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش میں وہ اس طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کے پیش نظر انا بی کی صحت و بقا کی وجہ تھی۔

انہیں یہ سب بتا کر گویا اس کے ذہن سے بھی ایک بوجھ ہٹ گیا تھا ورنہ اسے یہی فکر پریشان کر رہی تھی کہ کس طرح وہ انا بی سے چھپائے گی؟ اس طرح کل سے وہ نیند کے بہانے خاصا وقت گزار چکی تھی۔ بالآخر یہ بوجھ بھی دور ہوا تھا۔

ثانیہ پہلے بتا کر جا چکی تھی کہ وہ رخصت ہو کر لاہور چلی جائے گی، سو اس کی جانب سے اسے خدشہ نہیں تھا کہ وہ آ کر اس کا جھوٹ ثابت کر دے گی۔

"آفس نہیں جاؤ گی بیٹی؟" اُسے اطمینان سے پیر پسارے دیکھ کر وہ گویا ہوئیں۔

"وہ...... وہ انا بی! میری ملازمت، مطلب یہ کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے وہاں سے۔" روز روز کیسے بہانے بنا سکتی تھی۔ آج سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے چند لمحے غور سے اس کی جانب سوچتی نگاہوں سے دیکھا، پھر ایک اطمینان بھرا سانس

لے کر بولیں۔

''اچھا ہوا، ایسے بدکردار آدمی کے ساتھ کب تک گزارا کر سکتی تھیں۔ ملازمت ہماری ضرورت سہی مگر عزت اس سے زیادہ ضروری ہے۔''

''اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ گھر سے باہر یہ سارا وقت میں اس بدکردار شخص کے ساتھ گزار کر آئی ہوں، وہ بھی باعزت تو آپ کو میری زبان اور اس کی شرافت کا یقین آ جائے گا؟'' اس نے انا بی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔

''اچھا...... تو یہ فکر تم پر سوار ہے، تب ہی اس قدر خاموش و پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ کوئی بات نہیں، ایک در بند ہوتا ہے تو کئی در کھل جاتے ہیں۔ روزی دینے والا اپنے بندوں سے غافل ہرگز نہیں رہتا۔ بہت جلد انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔''

وہ بڑے دلار سے اس کو تسلی دے رہی تھیں۔ جبکہ یکلخت حالات کی نزاکت محسوس کر کے ان کی آنکھوں میں تفکرات جھلکنے لگے تھے۔

''انا بی، فاخرہ باجی کے ہاں سے مجھے اس ہفتے کی تمام اخبار لا دیں۔ اُردو، انگلش دونوں۔ شاید وہاں کوئی خالی ویکنسی نظر آ جائے۔''

انہوں نے پہلے اخبارات لا کر دیئے پھر پکانے کا سودا لینے بازار چلی گئیں اور وہ اخبارات پھیلائے مطلوبہ نوکری تلاش کر رہی تھی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزارنے کے باوجود کوئی ڈھنگ کی نوکری کا اشتہار موجود نہیں تھا۔ اس نے بددل ہو کر اخبارات ایک جانب رکھے اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔ انا بی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ اس نے آٹا نکال کر گوندھنا شروع کر دیا۔ فارغ ہوئی تو اسی دم انا بی آ گئیں۔ وہ پکانے کے لئے قیمہ پالک لے آئی تھیں اور ایک لفافے میں گرم سموسے۔

''لو، کھا لو۔ ناشتے میں بھی صرف چائے پی ہے۔'' وہ پلیٹ میں سموسے نکال کر اس کی جانب بڑھاتی ہوئی کہنے لگیں۔

''کھانا آج میں ہی بناؤں گی۔''

''نہیں، تم آرام کرو۔ یہ کام میرا ہے۔''

''آپ اس عمر میں آرام نہیں کرتیں اور مجھے آرام کرا رہی ہیں۔'' سموسے کھاتے ہوئے وہ ہنس کر بولی۔

''یہ چند روز ملے ہیں تو آرام کر لو۔ ورنہ صبح سے رات تک کہاں آرام نصیب ہوگا۔''

انا بی نے اسے کچن میں نہیں جانے دیا اور خود بھی بہت جلد پکا کر فارغ ہو گئیں۔ اس عمر میں بھی ان کی پھرتی اور نفاست قابل دید تھی۔ وہ ہر کام بہت پھرتی اور صفائی سے کرتی تھیں۔ خاص طور پر کھانا بہت مزیدار بنایا کرتیں، کسی وقت میں ان کے ہاتھ کی سلائی، کڑھائی بہت مشہور تھی۔ اب آنکھوں کی کمزور بصارت کے باعث لوگوں کے لئے سلائی نہیں کرتی تھیں مگر اپنے اور خضریٰ کے کپڑے خود سیتی تھیں۔ خاص طور پر خضریٰ کے کپڑوں کی ڈیزائننگ اسی طرح سے کرتیں کہ عام کپڑا بھی خاص لگتا تھا۔

جب تک وہ پکانے سے فارغ ہوئیں تو خضریٰ گھر کی صفائی کر چکی تھی۔ وہ کچن سے باہر آئیں اور خضریٰ کے لئے چائے کا ایک کپ بنا کر لے آئیں۔ وہ اس کا ایسے ہی خیال رکھتی تھیں جتنا ایک لائق و فائق ہونہار کماؤ پوت کا رکھا جاتا ہے۔

''کیا بات ہے انا بی، آپ کیوں اس طرح چکر لگا رہی ہیں؟'' چائے پینے کے دوران اس نے محسوس کیا وہ کچھ مضطرب سی اِدھر اُدھر گھوم رہی ہیں تو پوچھ بیٹھی۔

''وہ...... کچھ نہیں...... دراصل مجھے جانا ہے۔''

''کہاں؟''

''وہ......'' اس لمحے انا بی کی بوکھلاہٹ ظاہر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کچھ چھپا رہی ہیں لیکن چھپا نہیں پا رہیں۔

''وہ فاخرہ کے ہاں جانا ہے۔ وہاں مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔'' انہوں نے نگاہیں چرا کر کہا۔

''اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ چلی جائیں آپ۔''

''اچھا، میں جا رہی ہوں۔ قیمہ چولہے پر رکھا ہے۔ ٹماٹر گل جائیں، پانی خشک ہو

جائے تو بھون کر پالک ڈال دینا۔ وہ پانی میں بھیگا ہوا ہے۔"

"اچھا" اس نے ان کے جانے کے بعد اندر سے کنڈی لگائی اور ایک مرتبہ پھر اخبارات کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگی۔

☆

شاہ زیب صاحب جو بیٹے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے، آج گزرتا دوسرا دن بھی جب اس کے انتظار میں کٹ گیا اور آنے والا نہیں آیا تو ان کے اندر بیٹے کی جانب سے تڑپ اور فکر میں شدید اضافہ ہوگیا۔ وہ اہم میٹنگ کینسل کر کے گھر چلے آئے۔

شانزل خان ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی زندگی کا واحد سہارا۔ وہ اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور یہ اس کی شدید ترین محبت کی تاثیر ہی تھی جو وہ اپنا از حد قیمتی بزنس ٹور کینسل کر کے وطن چلے آئے اور اپنے وسیع با اختیار اثر و رسوخ کے ذریعے ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچا ڈالا جو ان کے بیٹے کے دشمن بن بیٹھے تھے۔ کام کچھ ایسی سرعت اور خاموشی سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔

"عارفین! شانزل کہاں ہے؟" انہوں نے بریف کیس اسے دیتے ہوئے استفسار کیا۔

"چھوٹے صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔" اس نے فرمانبرداری سے کہا۔

"کمرے میں...... طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟ صبح سے اب تک کمرے میں کیوں ہے؟" جواب کے لئے انہوں نے عارفین کا انتظار نہیں کیا اور بے قراری سے کمرے کی طرف آ گئے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی ناگوار بو نے ان کا استقبال کیا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ حالانکہ باہر شام کی خوبصورت روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے گلاسز سے پردے سرکائے تو وہاں خوبصورت اجالا بکھر گیا اور وہ سامنے بیٹھا نظر آ گیا جس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ گویا کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔

"عارفین! پردے ڈال دو، مجھے روشنیوں کی ضرورت نہیں ہے۔" منہ سے دھواں

خارج کرتے ہوئے اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

"آپ اندھیروں سے دوستی کب کر بیٹھے میری جان! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ میں کب سے تڑپ رہا ہوں اپنے بیٹے کے لئے اور یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بڑھی ہوئی شیو، پرشکن لباس، بے ترتیب بکھرے بال اور نشے کی زیادتی سے سوجے ہوئے پپوٹے، بوجھل انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں، عجیب سی وحشت اور بے چارگی اس کے حلیے سے جھلک رہی تھی۔ وہ افسردہ اور دل گرفتہ سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

"اوہ...... ڈ...... ڈیڈی آپ؟" باپ کو سامنے دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑے ہونے کی کوشش میں اس زور سے لڑکھڑایا کہ اگر آگے بڑھ کر وہ اسے سہارا نہ دیتے تو وہ ٹیبل پر منہ کے بل گرتا۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا ہوا ہے؟ کیا جھگڑا ہوا ہے کسی سے؟" وہ اسے بازو کے گھیرے میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

"مجھ...... سے...... کون...... جھگڑا...... کر سکتا...... ہے...... ہمت...... نہیں...... کسی...... کی......"

"اس وقت حواسوں میں نہیں ہو، بہتر ہے آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے دیکھ کر ان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ شانزل اس وقت نشے میں دھت تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور سر ان کے شانے سے جا لگا تھا۔

شاہ زیب صاحب نے بڑی محبت سے اس کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور پھیرتے رہے۔ جوان بیٹے کی ایسی حالت پر ان کے دل پر چرکے لگ رہے تھے۔ اس کے ڈرنک کرنے کی عادت اور سگریٹ نوشی ان سے مخفی نہیں تھی بلکہ لڑکیوں سے دوستی، تعلقات کی نوعیت سے بھی پوری طرح باخبر رہا کرتے تھے۔ اور ان کی نگاہ میں اس کی یہ حرکتیں معیوب یا قابل سرزنش نہیں تھیں کہ جس سوسائٹی میں وہ موو کرتے تھے، وہاں ایسی سرگرمیاں اسٹیٹس کا حصہ تھیں۔ روک ٹوک، پابندی کا تصور ہی نہ تھا۔ لیکن اب بیٹے کی حالت دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ وہ غافل رہ گئے۔

"خضر...... خضری...... خضر......" اچانک ہی مدہوشی کے عالم میں وہ بڑبڑایا تھا۔ پھر ایک دم پہلے کی طرح غافل ہوگیا۔

شاہ زیب صاحب چونک اُٹھے۔ اس کے منہ سے کسی لڑکی کا نام سننا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی بلکہ جس بات نے چونکایا، وہ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے وہ سمجھ گئے کہ اس نام کی ٹینشن شانزل کو جکڑے ہوئے ہے جس نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے کہ وہ دین و دنیا سے بے نیاز باپ سے لاپرواہ شدید نشے میں بھی اس کے نام کو رٹ رہا ہے۔

کافی دیر وہ اس کا سر شانے سے لگائے بیٹھے سوچتے رہے پھر عارفین کو آواز دی۔ انہیں معلوم تھا وہ حسب عادت دروازے کے پاس موجود ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ پہلی آواز پر ہی وہ اندر آکر بولا۔

"جی صاحب!"

اس کی مدد سے انہوں نے شانزل کو بیڈ پر لٹایا اور اسے کھڑکیوں پر پردہ ڈال کر باہر آنے کا حکم دے کر اپنے روم میں آگئے۔ بیٹے کی ایسی حالت دیکھ کر انہیں اپنے سارے حوصلے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انہوں نے اس کے لئے بہت اچھے روشن خواب دیکھے تھے مگر وہ کن راستوں پر چل نکلا تھا۔ روشنیاں چھوڑ کر اندھیرے سے دلچسپی کیوں ہوگئی تھی؟

"بڑے صاحب! آپ نے مجھے بلایا تھا؟" چند لمحوں بعد عارفین آکر مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"شانزل سے کون کون ملنے آیا تھا؟"

"کافی لڑکیاں آئی تھیں، لیکن صاحب پہلے ہی حکم دے چکے تھے کہ کوئی آئے تو کہہ دوں صاحب گھر پر نہیں ہیں اور میں نے یہی کہا۔ سب ہی واپس چلی گئیں۔ صاحب کسی سے بھی نہ ملے۔"

"ہوں...... سب لڑکیوں کو جانتے ہو؟ ان کے نام معلوم ہیں؟"

عارفین نے ایک طویل فہرست ان کے گوش گزار کردی شانزل کی گرل فرینڈز کی، مگر مطلوبہ نام انہیں نہیں ملا تو کافی توقف کے بعد وہ گہرے لہجے میں پوچھنے لگے۔

"کوئی نام بھول تو نہیں گئے؟"

"نہیں صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہیں اور سب کو جانتا ہوں۔"

"خضری...... کون لڑکی ہے یہ؟" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"خضری؟ اس نام کی تو کوئی لڑکی صاحب کی دوست نہیں۔"

"شیور؟"

"جی صاحب جی! مجھے پکا یقین ہے، صاحب کی اس نام کی کوئی دوست نہیں ہے۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "ہوسکتا ہے صاحب جو ابھی کچھ دن شہر سے باہر رہے ہیں، وہاں ان کی اس لڑکی سے ملاقات ہوگئی ہو تو معلوم نہیں۔"

"پھر آج سے تمہاری ڈیوٹی ہے یہ، مجھے معلوم کر کے بتاؤ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا فیملی بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟ اور تم جانتے ہو نا اگر اس بات کی خبر تم نے شانزل کو کر دی تو میں تمہارا کیا حشر کروں گا؟" انہوں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"میں کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

☆

"انا بی! کہاں رہ گئیں آپ؟" اس نے پھیلتے اندھیرے کو دیکھ کر پریشانی سے سوچا۔ وہ بارہ بجے گھر سے گئی تھیں اور اب مغرب کی نماز پڑھ کر وہ کافی دیر سے فارغ بیٹھی تھی۔ ان کی آمد کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

اس کی پریشانی بڑھنا فطری عمل تھا۔ اس نے چادر اوڑھی اور دروازے پر باہر سے کنڈی لگا کر برابر فاخرہ کے گھر سے انا بی کو بلانے پہنچ گئی۔

وہاں فاخرہ نے بتایا کہ انا بی صبح کچھ دیر کے لئے آئی تھیں پھر دوبارہ نہیں آئیں۔ ان کے جواب نے اس کی پریشانی دو چند کر دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں اب کہاں

دیکھے کہ محلے میں کسی سے اتنے تعلقات نہیں تھے کہ وہ یوں اطمینان سے کسی کے گھر جا کر بیٹھ جائیں، جبکہ اس کی عادت کو جانتے ہوئے وہ کبھی زیادہ دیر بازار میں بھی نہیں لگاتی تھیں کہ وہ پریشان ہو کر دروازے کے چکر کاٹے گی۔

اب کہاں چلی گئیں وہ؟

کہاں انہیں تلاش کروں؟

کس سے پوچھوں ان کے بارے میں؟

فاخرہ نے بہت روکا کہ منہ میٹھا کر کے جائے مگر اپنی پریشانی میں اس وقت اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ان سے معذرت کر کے واپس گھر چلی آئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں چلی گئیں، انہیں کدھر تلاش کرے؟ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اناں بی مسکراتی ہوئی اندر آئیں اور اسے پریشان دیکھ کر بولیں۔

"ہاں مجھے یہی فکر تھی کہ تم دروازے کے چکر کاٹ رہی ہو گی۔ جلدی جلدی کرتے بھی یہ وقت ہو گیا۔"

"فاخرہ باجی کے بچے بہت تنگ کر رہے تھے کیا آج؟" وہ انجان بن کر بولی۔

"پہلے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دو۔ جڑواں بچوں کو سنبھالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ایک تو پہلوٹھی کی اولاد اور جڑواں۔ مزید ستم یہ کہ کوئی بزرگ نہیں ہے گھر میں۔" انہوں نے پانی پیتے ہوئے ہمدردی سے کہا اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اناں بی کے پیچھے وہ بھی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

"آپ آ گئیں۔ شکر ہے، فاخرہ بہت پریشان ہو رہی ہے۔ اس نے کہا پوچھ کر آؤں آپ آئیں یا نہیں؟" دروازے پر فاخرہ کے شوہر کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر خضریٰ نے تیزی سے ان کا رنگ سفید پڑتے دیکھا تھا۔

"ہاں...... ہاں میاں! میں بھلا کہاں جاؤں گی۔" پیچھے خضریٰ کو دیکھ کر وہ بوکھلا رہی تھیں۔

"خضریٰ بہن بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ وہ سمجھیں کہ شاید آپ ہمارے گھر پر ہیں

اور وہاں آپ کو نہ دیکھ کر وہ اور بھی پریشان ہو گئی تھیں۔"

"فاخرہ کو سلام کہنا، بچوں کو پیار دینا۔ کل آؤں گی کہہ دینا فاخرہ سے۔" ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ گویا کسی چور کو موقع واردات پر ہی پکڑ لیا گیا ہو۔ فاخرہ کے میاں کے جاتے ہی وہ تیزی سے اندر کی کنڈی لگا کر پلٹیں تو خضریٰ سے نگاہیں چرا کر اندر بڑھ گئیں۔

گھر سے نکلتے وقت وہ یہ بھول ہی گئی تھیں کہ اگر انہیں واپسی میں دیر ہو گئی تو وہ فاخرہ کے ہاں انہیں بلانے پہنچ سکتی ہے اور ان کا بھرم، ان کا راز، ان کی محنت لمحوں میں عیاں ہو کر مٹی ہو جائے گی۔ اب کس طرح اسے سمجھائیں؟ کس طرح یقین دلائیں کہ وہ جو کر رہی ہیں، دونوں کی ہی مجبوری ہے۔

انہوں نے دل گرفتگی سے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ اسے اب سچ سچ بتا دیں۔ آج کل وہ گھر میں تھی اور نہ معلوم کتنے عرصے بعد اسے دوبارہ ملازمت ملے اور وہ روزانہ کیا کیا بہانے بنا سکتی تھیں۔ پہلے اس طرح ہوتا تھا، جہاں وہ گھر سے آفس جانے کے لئے نکلی، اس کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ اپنا کام نمٹا کر چلی جایا کرتی تھیں اور شام کو اس کے آنے سے قبل آ جایا کرتیں۔ اس طرح وہ کبھی محسوس ہی نہ کر پائی کہ وہ روز گھر سے جاتی ہیں۔

اسے سچ سچ بتانے کا ارادہ کیا تو دیکھا وہ کمرے میں نہیں ہے۔ وہ صحن میں نکل آئیں۔ امرود کے درخت کے نیچے چارپائی پر وہ دوپٹے میں منہ چھپائے روتی ہوئی نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھیں۔

"کیوں رو رہی ہو؟ کیا بات ہوئی میری بچی؟" وہ اسے سینے سے لگا کر خود بھی رونے لگیں۔ مگر اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔

"کچھ بولو تو سہی، کیا ہوا؟"

"کہاں گئی تھیں آپ؟ سارا دن آپ کی واپسی کے انتظار میں گزر گیا۔ گھبرا کر فاخرہ باجی کے گھر سے آپ کو بلانے گئی تو وہ کہنے لگیں آپ صبح کچھ دیر کے لئے آئی تھیں اس

کے بعد نہیں آئیں۔ یہ سن کر آپ کو لفظوں میں نہیں بتا سکتی کہ میری کیا حالت ہوئی۔''
اُس نے ہچکیوں کے دوران بتایا تو انہوں نے پیار سے اسے لپٹا لیا۔

''تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گی میری بچی! تمہاری خاطر تو زندہ ہوں۔''

''کہاں گئی تھیں آپ؟ اب آپ کو سچ سچ بتانا ہوگا۔''

''ہوں.... میں فیصلہ کر چکی ہوں سب کچھ سچ بتانے کا۔ مگر تم کو بھی وعدہ کرنا پڑے گا کہ میری بات سن کر خفا نہیں ہوگی اور نہ ہی دل کو لگاؤ گی۔'' وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر بے حد نرمی و شفقت سے گویا ہوئیں۔ جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''میں ایک گھر میں کھانا پکاتی ہوں۔ بہت اچھی فیملی ہے، تنخواہ بھی مناسب ہے اور پریشان بھی نہیں کرتے۔ بہت عزت دیتے ہیں۔ دیکھو، اب تم خیال مت کرنا کہ میں نوکری کیوں کر رہی ہوں۔ حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تمہاری ساری تنخواہ رافع فیاض کو دے دیتی ہوں۔ پھر گھر میں برتنے کے لئے بھی تو رقم درکار ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے سوچا، قرض بھی ہلکا ہو جائے گا اور سارا دن گھر میں فضول گزر جاتا ہے تو کچھ حاصل ہی ہو جائے گا۔''

''انا بی! یہ بات آپ نے مجھ سے چھپائی کیوں؟'' اس کے ہونٹوں سے دھیمی آواز ابھری۔

''بس، اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک طرف پڑے پڑے تو لوہے کو بھی زنگ لگ جاتا ہے پھر میں تو انسان ہوں، اس طرح میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں ورنہ بیمار بن کر رہ جاؤں۔ چلو اب پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر نماز پڑھ کر سوئیں گے۔'' اپنے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھا لیا تھا۔ خضریٰ کچھ بولی نہیں مگر اس کا سرخ پڑتا چہرہ اور دوبارہ بھیگتی نگاہیں اس کے اندر پھوٹتی بے چینی و ناپسندیدگی کا پتہ دے رہی تھیں۔

صبح نماز و تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد نیند نہیں آئی تھی۔ انا بی ناشتہ بنانے لگیں، وہ اپنے اور ان کے کپڑے نکال کر پریس کرنے لگی۔ پھر ناشتے سے فارغ ہو کر

تیار ہوگئی۔

''انا بی! کل پیپرز سے میں نے کچھ ایسے ایڈریس نوٹ کئے تھے جہاں ملازمت ملنے کی امید ہے۔ دعا کریں بہتر جاب مل جائے۔ مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ آپ پریشان مت ہونا۔''

''اللہ تمہیں کامیاب کرے، اپنے حفظ و امان میں رکھے۔'' اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے صدق دل سے دعا دی۔

''آپ وعدہ کریں مجھ سے۔'' وہ ان کا نحیف و نزار ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

''کیسا وعدہ بیٹی؟''

''مجھے ملازمت مل جائے گی تو آپ نوکری فوراً چھوڑ دیں گی۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ یہ نوکری کیا دُکھ دے رہی ہے؟''

''بہت بڑا دُکھ۔ آپ نہیں سمجھتیں انا بی۔ آپ اس عمر میں بھی میری خاطر چند سو روپے کی خاطر کسی کی غلامی کر رہی ہیں۔ یہ احساس، یہ دکھ مجھے اندر ہی اندر کند چھری کی طرح گھائل کئے دے رہا ہے۔ ساری زندگی آپ نے محنت کی، مشقت کی، خود کو مشین بنا لیا۔ اب..... اب تو آرام کیجئے، زندگی کی راحت و مسرت پر کیا آپ کا کوئی حق نہیں ہے؟ ساری عمر یونہی محرومیوں اور مشقتوں میں گزاریں گی؟''

''اچھی خاصی تو زندگی گزر رہی ہے میری بچی۔ بیکار سوچوں کو دل میں جگہ نہیں دیا کرتے۔ زندگی کی یہ خوشیاں، یہ آرام کیا کم ہے کہ ہم صرف اللہ کے محتاج ہیں۔ رب نے ہمیں ہاتھ پیر چلانے، دماغ استعمال کرنے کی صلاحیت دی ہے ورنہ ان لوگوں سے پوچھو کہ جو کسی وجہ سے ان نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں تو دولت و ثروت حاصل ہونے کے باوجود ان مسرتوں سے محروم رہتے ہیں جو ہمیں حاصل ہیں۔ اور تم نے یہ کیا کہا کہ روپے کی خاطر میں کسی کی غلامی کر رہی ہوں؟ بہت غلط خیال ہے یہ۔ شاید تم یہ سوچتی ہو گی بلکہ تمہیں شرمندگی محسوس ہو رہی ہوگی یہ سوچ کر کہ میں باورچن بنی ہوئی ہوں، ان لوگوں کا کھانا پکاتی ہوں۔ میری بیٹی! محنت میں شرمندگی و شرمساری نہیں محسوس کرنی

چاہئے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے بندہ خود ہاتھ پیر چلائے۔ محنت کرنے والوں کی عزت ہوتی ہے۔''

انہیں پہلے سے احساس تھا کہ وہ ضرور مخالفت کرے گی۔ کیونکہ رات بھر اس کی بدلتی کروٹوں سے وہ اس کا ذہنی اضطراب و بے چینی محسوس کر چکی تھی۔ انہیں معلوم تھا وہ کبھی بھی ان کی ملازمت کو پسند نہیں کرے گی لیکن گھر کے حالات اکیلے کے بس کے نہیں تھے۔ اگر مسئلہ صرف ان دونوں کا ہوتا تو خضری کی تنخواہ سے با آسانی گزارہ ہو سکتا تھا۔ مگر اصل گمبھیر مسئلہ رافع فیاض کو وہ مخصوص رقم دینے کا تھا جو ہر ماہ کے شروع میں دینی ہوتی تھی۔ جو کبھی مجبوراً لیٹ ہو جاتی تو وہ بدتمیزی کرتا یہاں آ کر۔ کم از کم جب تک اس کی رقم پوری ادا نہیں ہو جاتی تب تک وہ ملازمت نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

''آپ فیصلہ کر چکی ہیں کہ مجھے اسی طرح گھائل کرتی رہیں گی؟''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ میں ماں ہوں قصائی نہیں۔ اس وقت تمہاری ضد میں صرف بچکانہ پن ہے۔ جذبات کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو گی تو خود ہی وقت و حالات کی نزاکت کا احساس ہو جائے گا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

☆

''السلام علیکم ڈیڈی! کیسے ہیں آپ؟'' ناشتے کی ٹیبل پر وہ ہشاش بشاش سا شاہ زیب صاحب سے مخاطب تھا۔ کل کی نسبت آج وہ کافی بہتر تھا۔ لباس بھی نیا تھا، شیو بنی ہوئی تھی، بال سلیقے سے سنوارے گئے تھے، چہرہ بھی خاصا فریش لگ رہا تھا۔ مگر آنکھیں وہی مخصوص حزن و سوز میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اس کے مسکراتے لبوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

''بالکل ویسا ہوں جیسا ایک زندگی سے لاپرواہ تاریکیوں سے عشق کرنے والے بیٹے کا باپ ہوتا ہے۔'' وہ آزردگی سے بولے۔

''اوہ، یہ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی آپ؟ مجھ سے کوئی شکایت ہے آپ کو؟'' سلائس پر جیم لگاتا اس کا ہاتھ رک گیا۔

''نہیں، شکایت تو مجھے اپنے آپ سے ہے۔ کیوں تمہارے بہتر مستقبل کی خاطر میں دولت کے انبار لگانے میں اس قدر محو ہو گیا کہ بیٹے کی تباہی کی طرف بڑھتے قدم روک نہ سکا۔ خرابیوں، خامیوں کو اپنی اعلیٰ سوسائٹی کے تقاضے سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا اور خود اپنے بیٹے کو جہنم کی طرف دھکیلتا رہا۔''

''ڈیڈی! پلیز کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں ٹھیک ہوں، بالکل فریش، بھلا مجھے کیا ہوا ہے؟''

''تمہیں کچھ ہونا بھی نہیں چاہئے ورنہ......''

''اوہ کم آن ڈیڈی! یہ کیا آپ بھی وومنز کی طرح ایموشنل ہو گئے ہیں۔ کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ ناشتہ کریں، بے مزہ ہو جائے گا تو کچھ نہیں کھا پائیں گے آپ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سلائس کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی پھر دانستہ ان سے اس انداز میں باتیں کیں کہ وہ افسردگی و پریشانی بھول کر اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ناشتہ بہت خوشگوار ماحول میں کیا گیا تھا۔

ناشتے کے بعد شاہ زیب صاحب آفس روانہ ہو گئے۔ وہ اخبارات لے کر لیونگ روم میں بیٹھ گیا اور کافی دیر مطالعہ کرتا رہا۔ عارفین کی آمد نے اس کی اس مصروفیت کو ختم کیا تھا۔ اخبارات ایک طرف رکھ کر وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''عارفین! ڈیڈی کل کمرے میں آئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اُس نے قریب آ کر مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

''ہوں، جب ہی آج اس قدر ڈسٹرب تھے۔ مجھے ذرا بھی یاد نہیں۔''

''صاحب! باہر فضہ بی بی آئی ہیں۔ میں نے انہیں بہت ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ کہتی ہیں جب تک آپ سے نہیں ملیں گی یہاں سے نہیں جائیں گی۔''

''لیس، تمہیں معلوم ہے نا کتنی ضدی ہوں۔ جو کہتی ہوں وہ کرتی بھی ہوں۔ اور مجھے یقین تھا کہ تم اندر ہی ہو اس لئے میں نے آج واپس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔'' شوخ مسکراہٹ ریڈ لپ اسٹک سے چمکتے ہونٹوں پر سجائے پُراعتماد انداز میں وہ اندر داخل

ہوئی تھی اور بہت بے قراری سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

عارفین وہاں سے چلا گیا تھا۔ شانزل نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

"ڈیئر! ناراض ہو؟" فضہ نے بہت حیرانی سے اس کی اس حرکت کو نوٹ کیا۔

"نہیں۔ تم سے ناراضگی کیسی بھلا؟"

"پھر......"

"کچھ نہیں۔ بتاؤ کیا پیو گی؟" اُس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دانستہ موضوع چینج کیا۔

"جو تمہیں پینا ہو۔" وہ ریڈ ساڑھی کا گولڈن بارڈر پلو ایک ادا سے اُنگلی پر لپیٹتی ہوئی بولی۔ شانزل نے انٹرکام پر عارفین کو کولڈ ڈرنک لانے کا حکم دیا۔

"کہاں رہے اتنے دن؟ میرا تو انتظار کرتے کرتے برا حال ہو گیا تھا۔"

"ہوں..... لگتا تو نہیں۔ بلکہ مجھے تو پہلے سے زیادہ کیوٹ لگ رہی ہو۔" اس نے بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔ گہرے گلے والے بغیر آستینوں کے گولڈن بلاؤز سے باہر اس کی گوری رنگت خوب دمک رہی تھی۔ میچنگ جیولری اور مہارت سے کیے گئے میک اپ میں اس کے حسن کی شادابیاں عروج پر تھیں۔

"کبھی تو دل سے بھی تعریف کر دیا کرو ڈیئر۔"

"تم اتنی تعریف کی بھوکی کیوں رہتی ہو؟"

"صرف میں نہیں، بلکہ ہر لڑکی یہی خواہش رکھتی ہے۔"

"کیا سب لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟"

"ہاں۔"

"نہیں، شاید کچھ لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں۔" اس کی نگاہوں میں ایک باوقار سراپا لمحے بھر کو لہرا کر غائب ہو گیا اور اس کے اندر اضطراب و بے چینی دوبارہ بیدار ہونے لگی۔

"کیا ہوا؟ تم ایک دم خاموش کیوں ہو گئے؟" فضہ نے اُس کی بدلتی کیفیت شدت سے محسوس کی تو فوراً دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔ لو، تم کولڈ ڈرنک پیو۔" اُس نے عارفین کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس کی جانب بڑھایا اور اپنے گلاس سے سپ کرنے لگا۔

"جلدی سے کپڑے چینج کرو، ہم لنچ اور ڈنر باہر کسی بہت اچھے ہوٹل میں کریں گے اور رات......"

"سوری فضہ! میں آج بہت بزی ہوں۔ کہیں نہیں جا سکوں گا۔"

"پھر کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔" فضہ کے لہجے میں تعجب تھا۔

"سوری...... نہ کل اور نہ پرسوں، بلکہ آئندہ کچھ ہفتے...... بلکہ کچھ ماہ میں بہت بزی رہوں گا۔ اس لیے تمہیں ٹائم نہیں دے پاؤں گا۔"

"نو.... نو.... نو امپاسبل۔ مجھے نہیں لگتا تم شانزل خان ہو۔ میں کیسے مان لوں تم شانزل خان ہو؟ تم جو میرے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ہر شے کو ٹھوکر مار دیا کرتے تھے۔ میرے لیے تمہاری بزنس ایکٹویٹیز کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں تمہارے لیے، آج میں خود چل کر آئی ہوں تو تم مجھے بتا رہے ہو کہ تمہارے پاس ٹائم نہیں ہے میرے لیے۔" وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، ہر وقت موڈ یکساں نہیں رہتا، بدلتا رہتا ہے۔"

"تمہارا موڈ ہی نہیں بلکہ تم خود بدل گئے ہو اور اس حد تک کہ پہچانے نہیں جا رہے ہو۔"

"بیٹھو نا، کہاں جا رہی ہو؟"

"جب تمہیں میری ضرورت ہی نہیں تو فضول ہے یہاں بیٹھنا۔" اُس نے خاصے جلے کٹے انداز میں جواب دیا اور گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"اوکے، ایز یو وش...... عارفین! مس کو احترام سے گیٹ تک چھوڑ آؤ۔" وہ فضہ کو جانے کا کہتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا جہاں فضہ اسے اتنی حیرانی سے دیکھ رہی تھی گویا شبہ ہو اس کی دماغی حالت پر۔

☆

''پندرہ دن ہو گئے بیٹی! دفتروں کے چکر لگاتے ہوئے، ہر بار ناکامی ہوتی ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کچھ دن گھر بیٹھ جاؤ، پھر دیکھ لینا۔ دراصل یہ کچھ حیران کن بات ہے کہ جس چیز کی ہمیں جس وقت شدید ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت ہماری آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔'' انا بی نے ناشتہ کر کے تیار ہوتی خضریٰ کو خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

''کبھی کبھی نہیں انا بی! ہماری زندگی ہی آزمائش بن کر رہ گئی ہے۔ آزمائش در آزمائش کے سلسلے کچھ اتنے دراز ہیں کہ زندگی کا معمولی سا بھی لطف ہم نہ اٹھا سکے۔'' اُس نے تیز ہاتھ چلا کر بالوں کو لپیٹ کر بینڈز لگائے تھے۔

''خوش نصیب ہیں ہم۔ اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی آزمائش میں ڈال کر ان کے یقین و ایمان کی پختگی کا امتحان لیتا ہے۔ اس سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔ آمین۔''

''انا بی، میں جا رہی ہوں۔ دعا کیجئے گا کامیاب لوٹوں۔'' وہ چادر اوڑھنے کے بعد بیگ کاندھے پر ڈالتے ہوئے بولی تو حسب معمول انہوں نے بے تحاشہ دعاؤں کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔

وہ طویل سفر طے کر کے کوچ کے ذریعے ڈرگ روڈ پہنچی جہاں ایک پرائیویٹ فرم میں ایک ویکنسی کا ایڈ اُس نے کل دیکھا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی لمحے بھر کو اُس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔ جس کے تصور سے بھی وہ نالاں تھی، وہ اندر سے نکل رہا تھا۔ دو شخص اور ساتھ تھے، دونوں کا انداز بتا رہا تھا کہ یقیناً وہ اُس کے ماتحت تھے۔ خضریٰ تیزی سے قریبی ستون کی اوٹ میں ہوگئی۔ شانزل ان دونوں کے ہمراہ کچھ فاصلے سے گزرا تھا۔

اُس کا اس طرح گزرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ وہاں اس کی موجودگی سے بے خبر رہا تھا۔ وہ شکر کرتی ہوئی گیٹ کے نزدیک بیٹھے چپڑاسی کی طرف بڑھ گئی۔

''سنیں بابا! وہ جو صاحب ابھی گئے ہیں، وہ یہاں کیوں آئے تھے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں یہاں آج ہی آیا ہوں۔ لیکن آپ کیوں معلوم کر رہی ہیں؟''

چوکیدار کے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا تھا۔ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے وہ آگے بڑھ گئی۔ اندر ہال میں امیدواروں کی طویل قطاریں تھیں۔

وہ بھی نشست پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد منیجر صاحب نے معذرت کر لی یہ کہہ کر کہ کچھ ناگزیر وجوہات کے باعث انٹرویوز کینسل کر دیئے گئے ہیں۔ جلد دوبارہ کئے جائیں گے اور اس کی اطلاع اخبارات میں دے دی جائے گی۔ چند رسمی معذرتی جملے کہہ کر منیجر وہاں سے چلا گیا۔ چند لمحے قبل جو ماحول پُرسکوت تھا یکدم ہی مختلف آوازوں سے گونج اٹھا۔

''بے حسی و سنگدلی کی انتہا ہے۔ پہلے انٹرویو کے لئے بلاتے ہیں پھر فضول جھوٹی معذرت کر کے اسی طرح بھگا دیتے ہیں۔ ہمارے وقت اور پریشانی کا کوئی احساس نہیں ہے۔'' کسی کی آواز ابھری۔

''یہ سب دکھاوا ہوتا ہے۔ سیٹ تو پہلے ہی رشوت کے ذریعے فروخت ہو جاتی ہے۔''

''پہلے والدین ہماری اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں پھر ان نوکریوں کے چکر میں جیبیں خالی ہو جاتی ہیں۔'' وہ سب باتیں کرتے باہر نکل رہے تھے۔

خضریٰ بھی بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کتنی پُرامید اور پُرجوش ہو کر وہ آئی تھی کہ شاید آج نصیب جاگ جائیں اور کچھ تو سپیدۂ سحر اس کی زندگی میں نور پیدا کرے۔ مگر وقت خواہشوں اور سوچوں کے تابع نہیں ہوتا، اس کا الگ شاہانہ مزاج ہے۔ مہینہ اختتام پذیر تھا۔ اُسے فکر تھی اگر رافع فیاض کو روپے نہ بھیجے گئے تو وہ شخص گھر پر چلا آئے گا۔ پھر بھلا اس کی زبان کو کون لگام دے سکتا ہے؟

وہ اپنی سوچوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ معاً آف وہائٹ چمچماتی کار نے تیزی سے آ کر اُس کا راستہ بلاک کر لیا تھا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا تو ڈرائیونگ ڈور سے جھانکتے مسکراتے ہوئے شانزل کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں پڑ گئیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' اُس نے سخت لہجے میں کہا۔

''سوری..... آؤ میں ڈراپ کر دوں گا۔''

”تو تھینکس...... میں چلی جاؤں گی۔“

”انکار نہیں کرو، پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟ کس نے کہا تھا؟“

”دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے۔ میرے دل نے۔ مانتی ہو نا میری باریک بین نگاہوں کو؟ تم تو خود کو ستون کے پیچھے روپوش کر چکی تھیں مگر بھول گئیں کہ ہم بھی قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔“ وہ اُس کی سرد مہری کو نظر انداز کیے مسلسل خوشگواریت سے بات کر رہا تھا۔

”جی، میں بخوبی آگاہ ہوں آپ کی ان تمام خصوصی ”صلاحیتوں“ سے۔ اب برائے مہربانی مجھے جانے دیں۔“ اُس کا طنزیہ لہجہ عاجزانہ ہو گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اُس کی عقابی نگاہوں کو کوس رہی تھی کہ احتیاط کے باوجود وہ اسے کھوج چکی تھیں اور وہ بہت چالاکی سے یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ اسی راستے سے گزرے گی۔

”آپ اتنی غیریت برت کر مجھے رنج پہنچا رہی ہیں۔ کیا ہمارے درمیان دوستی......“

”ہمارے درمیان کوئی دوستی کا رشتہ نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے چیخی۔

”میرے خیال میں دشمنی کا رشتہ بھی نہیں ہے۔“ اُس کی دلکش مسکراہٹ بدستور گہری تھی۔

”دوستی یا دشمنی کا رشتہ کسی تعلق کی بنا پر بنتا ہے۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں تو تعلقات استوار کرنے کی ہر سعی کر کے شکست کھا چکا ہوں، اب تم ہی کوئی راہ بتاؤ۔“

”فضول ہے ہر کوشش، ہر چال، ہر مکاری۔ یہ بات آپ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ میں آپ کی ہوس کا شکار ہونے سے قبل موت کا شکار ہونا پسند کروں گی۔“ خضریٰ کے سرد اور مضبوط لہجے پر اس کی مسکراہٹ یکدم ہی بجھ کر رہ گئی۔ آنکھوں میں عجیب سا حزن پھیلتا چلا گیا۔ چہرے پر تاسف اور شرمندگی کے رنگ اُبھرنے لگے تھے۔

”جو شخص اپنے ضمیر کی سزا پہلے ہی بھگت رہا ہو، اسے مزید گھائل مت کرو خضریٰ!“

”اگر آپ کا ضمیر زندہ ہو گیا ہے تو یقیناً آپ کو اچھائی، برائی، نیکی اور بدی کا فرق بھی محسوس ہونے لگا ہو گا۔ اور اس وقت میری پوزیشن یہاں اس طرح کھڑے ہونے سے کس طرح متاثر ہو رہی ہے آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہوں گے۔ پلیز مجھے جانے دیں۔“

خضریٰ کی حساس نگاہوں سے اُس کی بدلتی کیفیت جس میں ندامت، شرمندگی اور تاسف تھا، پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ اُسے حیرانی تو ہوئی مگر یہ لمحہ تھا اس سے نجات حاصل کرنے کا۔

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میرے ساتھ چلی چلو۔ پلیز...... پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ اُس کے چہرے پر پھیلتے تردد کے سائے دیکھ کر وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”میں بہت مشکل میں ہوں۔ پلیز آپ میری مشکلات مزید نہ بڑھائیں۔ مجھے کوئی بات نہیں سننی۔“ وہ اُس کی کسی بات پر اب یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔

”صرف ایک بات۔ خدا گواہ ہے میری نیت میں کوئی کھوٹ یا بددیانتی نہیں ہے۔ میں صرف تم سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگنا چاہتا ہوں“ اُس کی نگاہوں میں ایک کرب آمیز دُکھ ہلکورے لینے لگا۔ سرخ انگارہ آنکھوں میں دُکھ بھرنے لگا تھا۔ ایک عالم کو اپنا تابع بنانے والا وہ خودسر، سنگدل، سرکش و ضدی شخص اس لمحے اس فقیر کی طرح کھڑا تھا گویا زندگی بھر اس کے کشکول میں کسی نے کوئی سکہ نہ ڈالا ہو۔ اپنی تمام اکڑ، برتری و مردانگی کا گھمنڈ بھول کر اس کے سامنے ایک ٹوٹے، بکھرے، شکست خوردہ شخص کی ایسی عاجزی و بے چارگی نے اسے اندر ہی اندر لرزا ڈالا تھا۔ وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔ ناٹ فار سیل چیزوں کو خریدنے والے بندے کی حالت از حد دگرگوں تھی۔

وہ خاموشی سے کار میں فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے تھینکس کہتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی۔ کار شفاف سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔

"کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو؟" وہ کچھ دیر بعد سنجیدہ بھاری آواز میں بولا۔

وہ قصداً خاموش رہی۔ شازل کا رویہ اس کے لئے عجیب تھا۔

"جو کچھ میں نے کیا، اس کے لئے معافی، معذرت و شرمندگی بہت ہی چھوٹے لفظ ہیں اور شاید بے معنی و بے وقعت بھی۔ خدا گواہ ہے، میں سچے دل سے معذرت مانگ رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ جب سے گھر آیا ہوں میرا سکھ، چین، آرام و سکون سب کچھ مجھ سے روٹھ گیا ہے، کھو گیا ہے۔ نہ مجھے راتوں کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو قرار......"

وہ بولتے بولتے جیسے تھک گیا تو لمحے بھر کو خاموش ہو گیا۔ اس کا تنفس تیز تھا اور خضریٰ نے محسوس کیا کہ اس تمام عرصے میں اسے مسلسل دھیمی کھانسی آتی رہی تھی۔

"ان دو ہفتوں کے عرصے میں نیند کو ترس گیا ہوں۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بہترین ڈاکٹرز، اعلیٰ ترین میڈیسنز کوئی مجھے سکون نہ دے سکا۔ میرے اندر کوئی پکارتا ہے کہ میں نے خضریٰ حیات کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اسے بہت ذہنی تکلیف اور بے سکونی دی ہے۔ اور شاید مجھ سے ڈر کر خوف و فکر کے باعث تمہاری نیندیں بھی خراب ہوئی ہوں گی۔ ہر لمحہ، ہر گھڑی بے سکونی و بے چینی کے کرب میں مبتلا رہی ہو گی۔ مجھے اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے، مکافاتِ عمل کا شکار ہو گیا ہوں میں اور اس عذاب سے نجات، اس سزا سے خلاصی مجھے تب ہی ملے گی جب تم مجھے معاف کر دو گی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ تم نے درست کہا تھا کہ کچھ لوگ طاقت و دولت کے گھمنڈ میں خود کو مختارِ کل سمجھنے لگتے ہیں۔ اور کتنے حقیر و بے وقعت ہوتے ہیں جب ذرا سے جھٹکے سے عرش سے فرش کی خاک چاٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"آپ اللہ سے معافی مانگتے رہئے۔ رب سے توبہ کیجئے۔ ذہنی سکون و راحت سچی توبہ میں ہے۔ جب بندے اللہ سے ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں، توبہ کی راہ نہیں اپناتے تو اسی طرح ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ اسی طرح سکون، راحت، چین اور مسرتوں کو ترستے ہیں۔ آج کل جہاں بھی نگاہ ڈالتے ہیں، مسلمانوں کو غیر مسلموں کے جبر و ظلم کا شکار دیکھتے ہیں، یہی وجہ ہے۔ میں بھی کوئی بے گناہ اور اتنی اعلیٰ درجے کی مسلمان نہیں ہوں

کہ میری وجہ سے کسی کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جائے۔ جو کچھ ہوا میں بھول چکی ہوں اور آپ بھی بھول جائیں اور عہد کریں کہ آئندہ کسی مجبور کی مجبوری سے ہرگز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

شازل کی آواز میں ایسا سوز اور ایسی تشنگی تھی کہ اسے یقین آ گیا جو وہ کہہ رہا ہے، وہ سچ ہے۔ وہ اپنے کئے پر نادم ہے۔ حقیقی معنوں میں شرمندہ ہے۔ کچھ دن کے اس کے ساتھ نے یہ تو اسے باور کروا ہی دیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے دو ٹوک اور سچ بات ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت اتنی ہی دگرگوں اور قابلِ رحم تھی۔

"اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف کر دیا؟" وہ پُر اشتیاق لہجے میں بولا۔

"میں نے کہا نا آپ اللہ سے معافی مانگئے، میں تو خود گنہگار بندی ہوں۔"

"ہاں...... ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بار کہو تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

"آپ بے مقصد ضد کر رہے ہیں۔" اس کے التجائیہ انداز نے خضریٰ کو ہراساں کر ڈالا۔

"میں ضد نہیں کر رہا، درخواست کر رہا ہوں، التجا کر رہا ہوں، بلکہ بھیک مانگ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ معاف کر دیں گی تو اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔" اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

"میں نے معاف کیا آپ کو۔ اللہ بھی آپ کو معاف کر دے۔" خضریٰ نے آہستگی سے کہا۔

"تھینکس...... تھینکس اے لوٹ خضریٰ۔" اس کا لہجہ مسرت سے کانپ رہا تھا۔

"مجھے یہاں اتار دیں۔" اس نے سامنے اسٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔

"اوکے۔ لیکن میری استدعا ہے تم سے اگر پوری کر دو تو مہربانی ہو گی۔ دراصل میں چاہتا ہوں تم مجھے کوئی مشورہ دو۔ ایسا مشورہ جو میرا لائف اسٹائل بدل کر رکھ دے۔ میں اس ماحول سے الرجک ہو گیا ہوں۔ یہ سچ ہے تم سے ملنے سے قبل میری زندگی مجھے کبھی کھوکھلی اور بے معنی نہیں لگی تھی۔ لیکن اب دل چاہتا ہے کوئی ایسا ضرور ہے جسے دیکھ کر

زندگی، زندگی لگے۔“

”آپ شادی کر لیجیے، کسی ایسی لڑکی سے جو آپ کو بہت چاہتی ہو۔“ اس نے بہت خلوص سے مشورہ دیا اور ساتھ ہی اسٹاپ پر اتر گئی۔ پیچھے مڑ کر شانزل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ وہاں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک وہ کوچ میں چلی نہ گئی۔

☆☆☆

”شانزل کہاں ہے؟“ شاہ زیب عارفین سے مخاطب ہوئے۔

”اپنے بیڈ روم میں سو رہے ہیں صاحب۔“

”اس وقت؟“ انہوں نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ ”معلوم بھی ہے لنچ کا وقت ہو رہا ہے۔“

”چھوٹے صاحب تاکید کر کے سوئے تھے کہ ان کو اٹھایا نہ جائے، وہ خود جاگ جائیں گے۔ بہت دنوں بعد اچھی نیند سونے جا رہے ہیں۔“ عارفین نے شانزل کے الفاظ دہرائے۔

”نہ معلوم کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو؟ میں بہت پریشان رہنے لگا ہوں۔“ وہ پریشان سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے پُروقار چہرے پر اُداسی اور تفکر چھایا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے صاحب! یہ سارا معاملہ اس خضریٰ نامی لڑکی سے تعلق ضرور رکھتا ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر لی یہ جاننے کی کہ خضریٰ نامی لڑکی کہاں ہے مگر معلوم نہ کر سکا۔ لیکن یہ بات لازمی ہے کہ وہ لڑکی صاحب سے جبھی ٹکرائی ہے جب وہ پچھلی بار کراچی سے باہر گئے تھے اور واپسی میں اس کا ہی کوئی روگ لگا کر لائے تھے۔“

”روگ؟ کیا بکواس کر رہے ہو۔“ شاہ زیب سخت لہجے میں گویا ہوئے۔

”معافی چاہتا ہوں صاحب! مگر میں بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ چھوٹے صاحب ان دنوں بہت زیادہ ڈرنک کرنے لگے ہیں اور سگریٹوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں اور مدہوشی کے عالم میں روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، معافیاں مانگتے ہیں خضریٰ نامی لڑکی سے۔ اور بھی نہ معلوم کیا کیا کہتے ہیں۔“ عارفین نے دبے لہجے میں اطلاع دی۔

”اوہ مائی گاڈ! کون ہے یہ خضریٰ؟ کسی آسیب کی طرح میرے بچے سے چمٹ گئی ہے۔ کچھ کرنا پڑے گا۔ ضرور کچھ کرنا ہو گا۔ میں اپنے بچے کو اس طرح تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ ان لڑکیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کرو جو شانزل سے ملنے آتی ہیں۔“

”اب تو سوائے فضہ بی بی کے اور کوئی نہیں آتی۔ صاحب نے سب سے ملنے سے منع کر دیا ہے، کسی سے نہیں ملتے۔ صرف فضہ بی بی اکثر چلی آتی ہیں اور وہ اس سے بھی نہیں ملتے۔“

”شانزل کے ساتھ نور محمد گیا تھا۔ اسے بلا کر معلوم کرو۔ وہ یقیناً جانتا ہو گا۔“

”نور محمد تو چھٹیاں لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔“

”اس کی چھٹیاں منسوخ کرو اور فوراً بلاؤ۔“ انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

☆☆☆

تاریکی کتنی ہی دبیز کیوں نہ ہو مگر روشنی کی ننھی سی کرن اس کا وجود ختم کر ڈالتی ہے۔ اُس نے شانزل خان کی نگاہوں میں ایسی ہی کرن دیکھی تھی۔ شاید کوئی لمحہ قبولیت کا اس کی زندگی میں در آیا تھا جو اس جیسے بدکردار اور آوارہ مزاج کو ہدایت و ایمان کی حیات افروز ضیاء بخش گیا تھا۔ آج اس بددماغ اور سرپھرے شخص کا کیسا روپ دیکھا تھا اس نے کہ ابھی تک اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ شانزل خان ہی تھا۔

ہاں، وہ اتنا برا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ خاصا وقت اس کی سنگت میں اس نے گزارا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی گرا ہوا اور اوباش فطرت ہوتا تو اپنی خواہش کی تکمیل کبھی بھی کر سکتا تھا۔ اور کیسے کیسے موقعے نہ ملے تھے اُسے، اگر وہ چاہتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ ضرور تھا کہ کئی مرتبہ ذومعنی جملوں سے اس نے اس کا خون ضرور خشک کیا تھا۔ کبھی نگاہوں کی بے باکیوں نے ہلا ڈالا تھا۔ مگر یہ سب ایک حد تک تھا۔ اس کی عصمت کا تقدس اس نے ہر آن ملحوظ رکھا تھا۔ ایسے شخص کو وہ صدق دل سے معاف کر چکی تھی۔ اب اس کے من میں کوئی کدورت و نفرت نہ تھی۔ بلکہ طبیعت بہت فریش ہو گئی تھی۔ ایک خوف تھا جو ہر دم رہتا تھا، زائل ہو گیا تھا۔

وہ جب سے آئی تھی شانزل خان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لئے انا بی کی خاموشی کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ اب اپنی سوچوں سے چھٹکارا ملا تو ان کی خاموشی محسوس کی۔

''انا بی! کیا بات ہے؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں۔'' وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

''ملازمت چھوٹ گئی۔ وہ لوگ کل ملک سے باہر جا رہے ہیں۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ اچھا ہوا خود ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔''

''ہوش کے ناخن لو بچی۔ مہینے کا آخر چل رہا ہے۔ وہ نامراد، بدبخت کبھی بھی آ دھمکے گا۔ کہاں سے دیں گے اسے روپے؟ وہ تو اڑیل ٹٹو بن کر بیٹھ جائے گا۔''

''آپ فکر مت کریں، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' اس بات کو وہ بھی سوچ رہی تھی مگر انا بی کو تسلی دینے کی خاطر مسکرا کر بولی اور ابھی انا بھی کوئی جواب نہ دے پائی تھیں کہ رافع فیاض دستک دے کر اندر چلا آیا۔

''ارے واہ! اب تو دروازہ کھلا رکھنے لگی ہو۔ کیا چکر ہے؟'' وہ اندر آ کر خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''چکر وکر کیا میاں! پڑوس سے بچہ آیا تھا وہی گیا ہے ابھی۔ ہم کنڈی چڑھانا بھول گئے۔''

''پڑوس سے بچے ہی آتے ہیں یا......''

''فالتو بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شرافت سے بیٹھ جاؤ۔''

''خضریٰ رانی! اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ بہت صبر کر چکا۔ اب تو مجھے میرا روپیہ چاہئے۔ ابھی اسی وقت۔ کوئی بہانہ، کوئی جواز نہیں سنوں گا۔ اور کان کھول کر سن لو، میں کہیں جانے والا نہیں، یہیں ڈیرے ڈالے رکھوں گا۔'' وہ آرام سے نیم دراز ہو کر بولا۔

''ارے میاں! دماغ درست ہے تمہارا؟ جو منہ میں آتا ہے، بک دیتے ہو۔''

''مجھے آنکھیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے بڑھیا! آج فیصلہ کر کے جاؤں گا۔ یا تو میری قرض کی رقم دو فوراً یا پھر...... خضریٰ کو لے کر جاؤں گا۔ ویسے بھی سال ہونے کو ہے۔''

''خضریٰ کو بھول جاؤ میاں! روپیہ تمہیں دیں گے۔ کوئی بھاگے تھوڑی جا رہے ہیں ہم؟'' انا بی غصے سے گویا ہوئیں جبکہ خضریٰ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ انا بی اور رافع فیاض کی خوب بحث ہو رہی تھی۔ وہ کسی طور پر واپس خالی ہاتھ جانے کو تیار نہ تھا جبکہ انا بی اسے قائل کرنے کی سعی میں سرگرم عمل تھیں۔ مگر ان کے دلائل، ان کی یقین دہانیاں، ان کی مالی پوزیشن کی طرح خالی و کھوکھلی تھیں۔ رافع کہاں بہل جاتا۔

''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' کافی دیر بعد جب ان دونوں کی بحث دیواروں سے باہر پرواز کرنے لگی تو وہ سپاٹ اور مضبوط لہجے میں بولی۔ وہ دونوں ایک دم خاموش ہو گئے۔

''ت...... تو...... تم...... سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ حیرت و مسرت سے بوکھلا اٹھا۔

''نہیں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' انا بی سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

''نہیں انا بی۔ یہ سچ ہے۔ میں رافع فیاض کو اپنا شوہر قبول کرلوں گی۔''

☆

رافع فیاض ہنس کر گویا ہوا۔ ''شوہر تو میں تمہارا ہوں۔ بس تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث صبر کر رہا تھا۔ اب اگر تم راہِ راست پر آگئی ہو تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہوسکتی ہے۔'' ازحد خوشی سے اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''خضریٰ! کیا ہوگیا ہے بیٹی، کیوں اول فول بک رہی ہو؟ یہ آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کسی بھلائی کی توقع کی جاسکے۔ کیوں خود کو مصیبت میں ڈال رہی ہو؟'' انا بی اُس کی ازحد سنجیدگی و اضطراب کو دیکھ کر سخت متوحش تھیں۔

''انا بی! جب مصیبتوں میں ہی زندگی بسر کرنی ہو تو پھر کسی ایک مصیبت کا انتخاب بہتر ہے، بلکہ دانش مندی ہے۔'' اُس کے سنجیدہ لہجے میں سکون سا در آیا تھا۔

''ہے تو بہت نامعقول نام، مگر تمہاری طرف سے ملا ہے تو دل و جان سے قبول ہے۔'' رافع فیاض خود کو ''مصیبت'' کا خطاب دینے پر خاصا مسرور نظر آرہا تھا۔

''بے غیرت و بے ضمیر لوگوں کی یہی نشانی ہے کہ گالی کو بھی اعزاز سمجھتے ہیں۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی خضریٰ بیٹی کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ جب ہوش میں آئے گی تو لاکھ بار لعنت بھیجے گی تم جیسے جھوٹے، مکار آدمی پر۔'' اس وقت رافع فیاض کا وجود انہیں ایک آنکھ نہ بھا رہا تھا سو خاصی بدلحاظی سے وہ اس سے مخاطب تھیں۔

''انا بی! پلیز غصے نہ ہوں۔ اور رافع فیاض، آپ دو دن بعد تشریف لائیے گا، تب تک میں انا بی کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔'' وہ قصداً مسکرا کر گویا ہوئی۔

''جو حکم سرکار۔ آپ راضی ہوگئی ہیں، اب ہمیں کسی کے غصے کی پرواہ نہیں۔ دو دن

بعد آؤں گا آپ کو ساتھ لے جانے کے لئے۔ تیار رہیے گا۔'' وہ مسرور سا جھومتا چلا گیا اور انا بی غصے سے اٹھ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ خضریٰ کی جانب انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

☼☆☼

نور محمد، مالک کے بلاوے پر فوراً ہی چلا آیا تھا اور ان کے سامنے اس کی ذرا جرأت نہ ہوئی کہ کسی بات سے پہلوتہی کرتا کیونکہ ان کا لہجہ اور انداز اتنا سخت تھا کہ وہ ان کے ہر سوال کا جواب سچ سچ دیتا گیا جو وہ خضریٰ اور شانزل کے بارے میں جانتا تھا۔

''یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس لڑکی نے شانزل کی ذرا پرواہ نہیں کی اور شانزل اس کے پیچھے اس حد تک پہنچ گیا کہ آج خود سے بیگانہ ہے اور وہ لڑکی ہر سو اس کو دکھائی دیتی ہے۔ سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے وہ اس کے تصور میں چھائی رہتی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ لڑکی بے قصور ہے۔'' نور محمد کے سچ سچ بتا دینے کے باوجود انہیں یقین نہ آ رہا تھا۔ ان کی فراخ پیشانی پر سلوٹیں تھیں اور آنکھوں میں بے یقینی اور اُلجھن۔

''اگر آپ اجازت دیں تو ایک عرض کروں صاحب جی؟'' نور محمد دھیمے لہجے میں بولا۔

''ہوں، کہو۔'' شاہ زیب صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے اجازت دی۔

''شاید منہ چھوٹا اور بات بڑی محسوس ہو آپ کو۔ مگر ہم وہی کہیں گے جو سچ ہے۔ کیونکہ یہاں سوال چھوٹے صاحب کی زندگی اور خضریٰ بی بی کی عزت کا ہے۔ صاحب کے پاس جتنی بھی لڑکیاں آتی تھیں، ان کا پک اینڈ ڈراپ میری ڈیوٹی تھی اور صاحب! ان لڑکیوں اور خضریٰ بی بی میں وہ فرق تھا جو دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں ہوتا ہے۔ وہ بہت باحیا اور نیک لڑکی تھی۔ شرافت اور پاکیزگی ان کی پُروقار شخصیت سے جھلکتی ہے۔ وہ بہت بلند کردار اور اچھی لڑکی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غریب ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی اپنی خوبصورتی کی قیمت نہیں لگائی۔ چھوٹے صاحب نے بہت کوشش کی تھی انہیں ہر طریقے سے خریدنے کی مگر انہوں نے اپنی عزت اور خودداری کا سودا ہرگز نہیں کیا۔''

"اچھا ٹھیک ہے، جاؤ۔" انہوں نے اسے جانے کا حکم دیا تو وہ سلام کر کے چلا گیا۔

وہ اُٹھ کر شانزل کے بیڈروم میں چلے آئے جہاں وہ اردگرد سے بے نیاز آنکھیں بند کیے کسی تصور میں غلطاں تھا۔

"ہیلو مائی سن، یہ کیا حالت بنالی ہے؟" بڑھا ہوا شیو، بکھرے بال، ملگجا لباس اور بیمار زرد چہرہ۔ جوان اور وجیہہ بیٹے کی حالت نے انہیں لرزا دیا تھا۔ وہ کس راہ پر چل پڑا تھا۔

"اوہ...... ڈیڈی! سو...... سوری...... میں...... مم......" باپ کو سامنے دیکھ کر وہ بوکھلا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہے یہ سب؟ نہ آفس آ رہے ہو اور نہ کسی سے ملتے، بات کرتے ہو۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ کیوں مجھے پریشانیوں کے صحرا میں بھٹکا رہے ہو بیٹے؟"

"آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں ڈیڈی۔ مت خود کو ڈپریسڈ کریں۔"

"یہ مجھ سے کہہ رہے ہو؟ باپ سے؟ میری ساری زندگی تمہاری فکر، تمہاری محبت میں گزری ہے۔ میری امیدوں اور خواہشوں کا آخری مرکز تم ہی ہو مائی سن۔ پھر کس طرح میں پریشان نہ ہوں؟ واپس لوٹ چلو اپنی دنیا میں میری جان۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ کیا شے تمہیں میسر نہیں ہے؟ جب بھی تم نے کوئی فرمائش کی، میں نے ڈھیر لگا دیا ہے تمہارے سامنے۔ ہر وہ کچھ خرید کر دیا ہے جس کی تم نے چاہ کی ہے۔ پھر اب یہ سب کیا ہے؟"

"آپ نے مجھے سب کچھ دیا ہے، ہر فرمائش پوری کی ہے ڈیڈی! آخری فرمائش بھی پوری کر دیجیے۔ مجھے سکون خرید کر لا دیجیے۔ بس اس کے بعد کوئی فرمائش نہیں کروں گا آپ سے۔"

"شانزل! کیا ہوا ہے؟ کیوں سکون کے متلاشی ہو؟ ایک پُر آسائش لائف گزارنے کے باوجود تم بے سکون ہو؟" انہوں نے تعجب و تکلیف سے جوان بیٹے کی سمت دیکھا جو بھری بہار میں خزاں رسیدہ درخت کی مانند نظر آ رہا تھا۔

"کس نے کہا ڈیڈی! سکون دولت اور پُر آسائش زندگی میں ہوتا ہے؟"

"کبھی غربت اور کسمپرسی کی زندگی دیکھی ہوتی تو یہ سوال کبھی نہ کرتے۔ کبھی وہ دور دیکھا ہوتا جہاں ترس ترس کر انسان صرف ایک وقت کی روٹی حاصل کرتا ہے، وہ بھی آدھا پیٹ تو محسوس ہوتا پیٹ بھر کر کھانے کا سکون کیا ہوتا ہے۔ جہاں بندہ ساری زندگی محنت، کڑی مشقت میں گزار دیتا ہے اور عمر کے آخری ایام میں جب عمر کا تقاضا آرام و آسائش سے کچھ دن گزارنے کا ہوتا ہے اور پھر بھی نہیں گزار پاتا تو ان سے پوچھو کہ آسائشیں کیا معنی رکھتی ہیں۔"

"آپ ہرٹ مت ہوں ڈیڈی! مجھے صرف سکون کی تلاش ہے۔ مجھے نیند تو آتی ہے مگر سکون نہیں ملتا۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی ہے مگر بے سکون ہوں۔ مجھے سکون کی تلاش ہے۔ میں سکون چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کاش آپ بزنس مین کی بجائے کوئی مزدور ہوتے، ہمیں پیٹ بھر کر روٹی نہ ملتی، زندگی کی گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے دھکیلنا پڑتا۔ بے شک ہمارے لاکرز دولت کے انباروں سے خالی ہوتے مگر سکون و طمانیت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہم۔ ڈیڈی! آج اس تکلیف دہ، بے سکون اور گناہوں بھری زندگی سے تو میں پاک ہوتا۔ جن پرندوں کو پرواز کی قوت نہیں ملتی یا جن کے پر آغازِ پرواز سے قبل توڑ کر پھینک دیے جائیں تو وہ کبھی بلندی کی طرف نہیں بڑھتے، ہمیشہ پستی میں گرے رہتے ہیں۔"

"شانزل...... شانزل! تم ٹھیک نہیں ہو...... ٹھیک نہیں ہو۔ میں ابھی ڈاکٹر صمد کو بلاتا ہوں۔ تم مجھے مینٹلی ڈسٹرب لگ رہے ہو۔" وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"نہیں، میں ہوش میں تو اب آیا ہوں۔ پاگل تو پہلے تھا۔ آپ ڈاکٹر کو بلانے کی زحمت نہ کریں۔ میرا مرض لاعلاج ہے۔" اُس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک حقیر لڑکی کی خاطر تم اپنے علاوہ میرے خیال، میرے اسٹیٹس، میری پرسٹیج سب کو اگنور کر دو گے۔" اس بار ان کے لہجہ میں غصہ و تنفر تھا۔

"خضریٰ حقیر نہیں ہے ڈیڈی! وہی تو وہ لڑکی ہے جس نے مجھے اس حقیقت سے

روشناس کرایا کہ میں کل تک اندھیروں کو اجالے سمجھ کر جی رہا تھا۔''

''وہ بے وقعت اور غریب لڑکی جو کل تک ہماری فرم میں چند ہزار کی ملازمہ تھی، آج تمہارے لئے سب کچھ ہوگئی۔ باپ سے بھی زیادہ اہم؟ کتنی ہائی کلاس، ہائی اسٹینڈرڈ کی لڑکیوں سے تم ملے، ان سے دوستی کی، ان کے ساتھ وقت گزارا اور پسند بھی کیا تو ایک ایسی لڑکی کو جو نہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور نہ اچھے خاندان سے۔''

''عورت کی حیا اور پاکبازی ہی اس کا ہائی اسٹینڈرڈ ہوتا ہے۔ اور جن ہائی کلاس موو کرنے والی لڑکیوں کی بات آپ کر رہے ہیں، بخوبی جانتے ہیں ان کے پاس کیا ہوتا ہے۔''

''میں تمہارا دشمن نہیں بیٹا۔'' اُسے باغی ہوتے دیکھ کر وہ نرم روی سے گویا ہوئے۔

''اگر آپ میرے دشمن نہیں ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے اور کبھی بھی خضرٰی کے متعلق ایسے لفظ استعمال مت کیجئے گا جو مجھے تکلیف پہنچائیں۔'' دھیمی دھیمی چلنے والی کھانسی اب شدت سے چلنے لگی تھی۔

''یہ دوستی اور میرے رتبے کا تقاضا نہیں ہے کہ میں تمہیں اس حال میں تنہا چھوڑ دوں۔ اگر تمہیں وہ لڑکی اتنی ہی عزیز اور پسند ہے تو میں اسے اپنی بہو بنانے کو تیار ہوں۔ مجھے لوگوں کی کبھی بھی پرواہ نہیں رہی۔ مجھے صرف اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی عزیز ہے۔'' اس کی ازحد محبت اور دگرگوں حالت نے بہت جلد انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ویسے بھی وہ عام دولت مندوں کی طرح مغرور اور خود پسند نہیں تھے۔

''یہ ممکن ہی نہیں ہے ڈیڈی۔'' وہ پرسوز مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ شادی شدہ ہے۔ اور شاید اپنے ہسبنڈ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''شادی شدہ ہے؟ پھر تمہاری یہ بے قراری، وحشت، جنون خیزی و اضطراب کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ وہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے، تم نے اس سے محبت کی؟'' وہ سخت حیران و پریشان تھے۔

''محبت؟ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ جبکہ یہ میں خود نہیں جانتا کہ مجھے اس سے محبت ہے، عقیدت ہے یا...... کچھ بھی نہیں۔'' اُس نے بالوں میں اضطرابی انداز میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں تم شادی کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ جب انسان کو سچے چاہنے والے کی محبت ملتی ہے تو وہ سب بھول جاتا ہے۔''

''ہاں، میں نے بھی یہی کہا تھا۔ میں شادی کروں گا ڈیڈی۔ مجھے سکون چاہئے، آرام چاہئے۔ ایسی نیند چاہئے جس سے بیدار ہوں تو تازگی اور راحت کا احساس ہو۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوا تو شاہ زیب پُرسوچ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے رہ گئے۔ شادی کے نام سے بھی نفرت کرنے والا بندہ آج خود اقرار کر رہا تھا۔

⁂☆⁂

''آپ نے کھانا پینا، مجھ سے باتیں کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے انا بی؟ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی اذیت دے رہی ہیں۔ رافع فیاض کے ساتھ رہنے کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں۔'' وہ خاموش اور ناراض بیٹھی انا بی کے قریب بیٹھ کر التجائیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''اب تم بہت عقل مند اور خود مختار ہوگئی ہو، بھلا میرے سوچنے سے کیا ہوگا؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہے انا بی۔ آپ مجھے دل و جان سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ بچے بوڑھے بھی ہو جائیں تو اپنے بزرگوں کے لئے بچے ہی رہتے ہیں، ناسمجھ اور کم عقل۔ مگر انا بی! کبھی کبھی ایسا بھی دور آتا ہے بلکہ وقت آتا ہے کہ چھوٹوں کو اپنی بالشت بھر عقل سے ہی بڑے بڑے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں بے چارگی در آئی تو انہیں اس پر ترس آگیا۔

''میری بچی! میں کہتی ہوں اتنی جلدی اپنے رب سے مایوس نہیں ہو جاتے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ جلد ہمیں اس آزمائش کی گھڑی سے نکال لے گا۔ کیوں ساری زندگی کے لئے اس منحوس، دغاباز کا ساتھ قبول کر رہی ہو؟ اُس ذلیل شخص نے اول روز سے

جھوٹ در جھوٹ بولے۔ تمہاری مرحومہ ماں پر تہمت رکھی کہ شادی کے لئے اس نے قرضہ لیا اور پھر ہر ماہ روپے لینے کے باوجود جھوٹ بولتا رہا کہ اس کے پاس کم سے کم رقم پہنچی ہے۔ جو آدمی اپنی زبان کا پکا نہ ہو، اس سے آگے کیا امید رکھی جائے؟ جو لوگ سچے اور مخلص نہیں ہوتے، وہ کبھی بھی قابل اعتبار اور قابل بھروسہ نہیں ہوتے۔'' انہوں نے پیار سے اُسے سمجھانے کی سعی کی مگر سمجھتے وہ ہیں جو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی پریشان کن زندگی سے اس حد تک بددل ہو گئی تھی کہ اب اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تہیہ کر بیٹھی تھی جو کسی بھی اعتبار سے اس کے قابل نہ تھا۔

''جو اُس نے کیا، وہ خود بھگتے گا۔ کم از کم مجھے کمزور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم دونوں بغیر کسی مرد کے سہارے اس معاشرے کے گدھ نما مردوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قدم قدم پر ایسے لوگ ہماری راہ پر اپنی ناپاک آنکھیں کھولے بیٹھے ہوتے ہیں۔''

''اور رخسانہ کا کیا ہوگا؟ وہ تمہیں ٹکنے دے گی؟ جس عورت نے پہلی رات ہی تم سے سارا زیور لے کر، تمام سامان پر قبضہ جما کر خالی ہاتھ رات کی تاریکی میں تمہیں گھر سے نکال دیا تھا اب وہ، اس کے مسٹنڈے بھائی اور چنڈال ماں تمہیں رہنے دیں گے؟''

''انا بی! مجھے ڈر کی نہیں، دعاؤں کی ضرورت ہے۔ مجھے دعا دیں۔ کہیں تو میں سرخرو ہو جاؤں، کوئی گوشۂ عافیت میرے لئے بھی ہو جہاں چند دن زندگی کے سکون سے گزر جائیں۔''

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ مخصوص دستک سن کر خضریٰ، انا بی سے التجائیہ لہجے میں بولی۔

''پلیز انا بی! رافع فیاض سے آرام سے بات کیجئے گا۔ اور آپ بھی ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کر لیں۔''

''نہیں بی، مجھے معاف کرو۔ خاوند تمہارا ہے۔ تم ہی اس کے ساتھ جاؤ۔ میں یہاں رہ کر تمہارے لئے خوشیوں کی دعا کروں گی۔'' وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

❋☆❋

''شانی ڈارلنگ! بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہ پراسرار خاموشی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔'' فضہ نے ادائے دلربائی سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت سمندر کی ٹھنڈی ریت پر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ آتی جاتی لہریں ان کے قدموں کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ موسم ابر آلود تھا، ماحول پر ایک دلکش سحر چھایا ہوا تھا۔

فضہ پر اس موسم کا پورا پورا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ ویسے بھی شانزل کو اس نے بہت عرصے بعد اپنی طرف لوٹتے دیکھا تو مسرت وشادمانی سے بے خودی ہو رہی تھی۔

گو کہ وہ پہلے کی طرح شوخ، بے باک اور بے قرار نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت بدل گیا تھا۔ جو نگاہیں پہلے بے باکی سے اس کی جانب اٹھتی تھیں، اب تو جیسے وہ اس کی جانب اٹھنا ہی بھول گئی تھیں۔ عجیب کھویا کھویا، بیگانہ انداز تھا اس کا۔ اب بھی وہ اسے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا کہ کوئی ضروری بات کرنی تھی۔ مگر پچھلے ایک گھنٹے سے وہ خلاؤں میں نہ معلوم کیا کھوج رہا تھا کہ اس کی نگاہیں اردگرد سے بے نیاز خلاؤں میں گم تھیں۔ چہرے پر ازحد سنجیدگی طاری تھی۔ اس کی خاموشی کو دیکھ کر بالآخر فضہ کو بولنا پڑا۔

''یو لو می؟'' شانزل سرخ انگارہ نگاہیں اس کے خوبصورت چہرے پر ڈال کر بولا۔

''یس۔ دل و جان سے چاہتی ہوں تمہیں۔'' وہ خوشی سے گلنار ہو کر بولی۔

''کتنا چاہتی ہو مجھے؟'' لفظ رومانوی مگر لہجہ سپاٹ اور احساسات سے عاری تھا۔

''اتنا جتنا کسی نے کسی کو بھی نہ چاہا ہو۔ تم میری روح میں بستے ہو شانی۔ میں پہلے دن سے تمہیں چاہتی آ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا میری چاہت ایک دن ضرور خود کو منوائے گی اور وہ خوش نصیب دن آج آ گیا۔ تمہیں احساس ہو گیا میری محبت کا؟'' وہ جذباتی لہجے میں کہتی ہوئی اس کے شانے سے لگ گئی۔

''چلیں۔''

''کہاں؟''

''کورٹ۔''

"کیوں؟"

"میرج کرنے۔"

"تو...... یو آر جوکنگ؟" اُس کے چہرے کی پتھریلی سنجیدگی اور لہجے کے ٹھوس پن نے اُسے حیرانی و پریشانی میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ وہ حیرت سے بولی۔

"شادی مذاق تو نہیں ہوتی۔ دو رشتوں کا بندھن، دو دلوں کا ملن کس طرح غیر سنجیدہ بات ہو سکتی ہے ڈیئر! میں سیریس ہوں۔" اس کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

"مگر کیوں؟..... کیا انکل راضی نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" اُس نے اطمینان سے انکار کیا۔

"پھر ہم کورٹ میرج کیوں کریں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"مجھے سکون کی تلاش ہے۔ اور سنا ہے سکون اور سچی راحت سچے رفیق حیات کے وجود سے ملتی ہے۔ سو مجھے دنیا داری اور دکھاوے کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو سکون و راحت دے۔ ظاہری نمود و نمائش بے جا دولت کا اصراف ہے جو کبھی بھی حقیقی مسرت نہیں دیتا قلب کو۔ مجھے تسکین چاہئے، ذہنی، روحانی و قلبی۔" اُس نے کھوئے کھوئے کرب آمیز لہجے میں کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، ایسا کس طرح ممکن ہے کہ اس ملک کے ہائی اسٹینڈرڈ سے......"

"تمہیں مجھ سے محبت ہے کہ میرے ڈیڈی کے اسٹینڈرڈ سے؟" اُس کی بات قطع کر کے وہ غصے سے گویا ہوا۔

"شازل! جو بات تمہیں سوچنی چاہئے تھی، وہ میں سوچ رہی ہوں۔ تم اپنے ڈیڈی کے اکلوتے بیٹے ہو، ان کی تمام جائیداد کے......"

"سوری، میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں اب ڈیڈی کی دولت و جائیداد سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ خود محنت مزدوری کروں گا۔ اس دولت و جائیداد نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میرا سکون، چین، کردار، وقار و شرافت سب داغدار کر دی۔"

"اوہ شانی! مجھے لگتا ہے تم مینٹلی ڈسٹرب ہو۔ شاید بہت زیادہ ڈرنک کرنے لگے ہو جبھی اتنی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔" فضہ رنگ بدلتے چہرے سے اُس کی جانب دیکھتی ہوئی حیرانی و فکرمندی سے گویا ہوئی۔

"درست ہے میرا دماغ، ہوش و حواس قائم ہیں میرے۔ مجھے یہ بتاؤ بغیر دولت و جائیداد کے تم مجھے چاہو گی یا نہیں؟ ایک بے حیثیت و غریب انسان سے شادی کرو گی؟" وہ اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں بولا۔ فضہ نے ایک بار پھر اُس کی جانب دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہو، اُس کا امتحان لے رہا ہو۔ مگر اس کی سرخ نگاہوں اور وجیہہ چہرے کے نقوش سے سچائی اور سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ وہ اُسے کچھ عرصے قبل سے جانتی تھی اور اس تھوڑے عرصے میں ہی سمجھ چکی تھی کہ وہ قول کا پکا تھا، جو کہتا وہی کرتا تھا اور اب بھی وہ جو کہہ رہا تھا، وہ بھی سچ تھا۔ بھلا اس جیسے سرپھرے اور ضدی شخص کا کیا بھروسہ کہ کب کیا ضد ذہن پر سوار ہو جائے اور اس کی جستجو میں محو ہو جائے۔

"مجھے جلد جواب دو۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔" وہ بے قراری سے بولا۔ اس وقت بھی وہ بڑی کشمکش کا شکار تھا۔ فضہ کا جواب ہی اس کی محبت کی کسوٹی پر پرکھا جانا تھا۔

"میرے خیال میں تم اچھا نہیں کر رہے۔ ہمیں اس طرح شادی نہیں کرنی چاہئے۔"

"کیوں؟" اس مرتبہ اس کے لہجے میں سرد مہری و بیزاری عود کر آئی تھی۔

"کسی غریب کی اولاد، دولت و جائیداد پا کر خوشحال و پُرسکون زندگی تو گزار سکتے ہیں مگر ایک ایسا شخص جس نے آنکھ کھولتے ہی دنیا کی ہر اس شے کو اپنی دسترس میں پایا ہو جو عام تو درکنار خاص لوگ بھی جن کی گرد نہیں پاتے بھلا ایک ایسا شخص کس طرح غربت و لاچاری کی زندگی گزار سکتا ہے۔ ناممکن ڈیئر۔"

"ممکن ہے فضہ۔ سچی محبت کی خاطر تو لوگ صحراؤں، جنگلوں، ویرانوں میں مسکن بنا لیتے ہیں۔ اگر تمہیں میرے سہارے کی ضرورت ہے تو میری محبت کی خاطر قربانی دینی پڑے گی۔"

"قربانی؟ محبت؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا بات کر رہے ہو؟" وہ تیز ہوا سے

اڑتے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے پریشان انداز میں بولی۔

''میں بہت سیدھی اور صاف بات کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے، تم میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہو تو تمہیں یہ پُرآسائش زندگی چھوڑنی ہوگی۔''

''تمہیں کیا ہوگیا ہے شانی؟ دولت کے بغیر زندگی کس طرح گزاری جاسکتی ہے؟''

''اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ سے نہیں میرے بینک بیلنس، میرے اسٹیٹس سے محبت ہے؟''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بغیر محبت کے زندگی گزاری جاسکتی ہے مگر بغیر دولت کے نہیں۔ اور جس ہائی کلاس میں ہم موو کرتے ہیں وہاں تو......''

''اسٹاپ اِٹ۔ مجھے اب کوئی فضول بکواس نہیں سننی۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کردوں۔ اور ہاں، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمارے درمیان اب کوئی رشتہ نہیں ہے میں کوئی وضاحت، کوئی دلیل نہیں سنوں گا۔ میرا آئیڈیل سطحی سوچ رکھنے والی لڑکی ہرگز نہیں ہے۔ جو محبت کرتے ہیں وہ صرف محبوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ محبوب کا ساتھ ہی ان کا زادِراہ بن جاتا ہے، جو محبت نہیں کرتے وہ زندہ نہیں ہوتے۔''

اپنی صفائی میں کچھ کہتی فضہ کو وہ خاموش رہنے کا اشارہ کرکے بہت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ فضہ کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ آتے ہوئے وہ جس قدر خوش اور پُرجوش تھی، واپسی کا سفر میں بہت ہی خاموش و متفکر دکھائی دے رہی تھی۔

بہت خوش نصیبی تھی اس جیسے خوبرو، اسمارٹ اور ہردلعزیز بندے کو پانا۔ مگر بغیر دولت و جائیداد کے وہ ایسا ہی تھا جیسے گولڈن رنگ ڈائمنڈ سے خالی ہو۔ اور وہ تو اپنی فیملی کی حسب خواہش ڈیڈ کے ڈاؤن ہوتے بزنس کو سہارا دینے کی خاطر اس کی جانب بڑھی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ شانزل پر دل و جان سے مرمٹی تھی مگر اتنی شدید محبت میں مبتلا نہ ہوئی تھی کہ خالی خولی شانزل کا ساتھ قبول کرکے کسمپرسی کی زندگی گزارتی۔

✲☆✲

''وہ انسان ہی بہت تکلیف و نقصان میں ہے جو اپنی ہوس زر اور حریص طبیعت کے

باعث نقصان در نقصان کے سودے کرتا ہے۔ نا سمجھ بھول جاتا ہے کہ اس کی رسّی صرف مخصوص حد تک ہی دراز کی جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا بن بیٹھا ہے۔ ہر شے کا مالک، ہر سمت پر اختیار رکھنے والا۔

ہر ذی روح پر قادر۔

یہ خوبیاں صرف ایک ذات کی شان ہیں۔

جو واحدہٗ لاشریک ہے، زمین و آسمان کا مالک ہے، تمام مخلوق کا مالک ہے۔ اللہ اپنے بندے کا ضبط، اس کا ظرف، اس کا حوصلہ، اس کا ایمان آزمانے کے لئے کچھ عرصے چھوٹ دے دیتا ہے اور بندہ سمجھتا ہے اس کی کبھی پکڑ نہیں ہوگی۔ اس کی رسّی کبھی کھینچی نہیں جائے گی۔ کبھی وہ اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال لے کر حاضر نہیں ہوگا۔ کبھی اندھیری قبر کی آغوش میں نہیں سمائے گا۔

آہ...... ایسے شیطانی دھوکے میں بہت سے دین و ایمان سے بیگانہ ہوکر آخرت کے سفر پر روانہ ہوجاتے ہیں اور ساتھ کیا ہوتا ہے؟ ساری زندگی غفلت میں گزاری، عمر کے گناہ، جھوٹ، فریب، اپنوں سے کی گئی حق تلفیوں کے انبار۔''

''چھوڑیں انا بی! چلا گیا وہ...... اب تو اس کو اچھے نام سے یاد کیجئے۔'' خضریٰ نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

''ہاں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ جتنے دُکھ اور تکلیفیں اُس نے ہمیں دیں، وہ ہم نے معاف کردیں۔ اللہ بھی اسے معاف کرے۔'' وہ طویل سانس لے کر گویا ہوئیں۔

رافع فیاض اُس دن خضریٰ کو گھر لے جانے کا کہہ کر گیا تو راستے میں سڑک پر ٹرک کی زد میں آکر ہلاک ہوگیا تھا۔ ان تک یہ خبر اخبار کے ذریعے پہنچی تھی، جس میں اس کی تصویر بھی تھی۔ کچھ لمحے تو اسے اپنے اعصاب منجمد ہوتے محسوس ہوئے، تقدیر کی کیسی ستم ظریفی تھی یہ...... جب وہ اس سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی تو کامیابی نہ ہوئی تھی اور اب جب وہ اسے دل و جان سے قبول کرنے کو تیار تھی تو وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر اس دنیا سے ہی چلا گیا تھا۔

وہ برا تھا، جھوٹا و مکار اور فریبی تھا۔ اس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ فطرتاً تو انہیں اس سے آسانی سے چھٹکارا پانے پر خوشیاں منانی چاہئے تھیں مگر وہ حساس و ہمدرد طبیعت کی مالک تھیں۔ پھر اس کی اچانک موت نے اسے کافی دن تک گم صم و افسردہ رکھا تھا کہ وہ جیسا بھی تھا مگر اس سے قانونی و معاشرتی رشتہ تھا۔

''میں سوچ رہی ہوں اب کوئی بڑی رقم کی ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی جو میں اعلیٰ اور پُرکشش جاب کی تلاش میں سرگرداں رہوں۔ اب صرف ہم دو ہیں اور ہمیں معقول رقم کی ضرورت ہوگی جس کے لئے میں صبح کی شفٹ میں کوئی جاب تلاش کرلوں گی۔ ٹیوشن سینٹر کھول لوں گی گھر کے ایک کمرے میں۔ آپ چپ کیوں ہیں انا بی؟'' انہیں سوچوں میں گم دیکھ کر وہ استفسار کرنے لگی۔

''میں سوچ رہی ہوں اس طرح کب تک زندگی گزارو گی؟ صبح اسکول، شام کو ٹیوشن پڑھاؤ گی۔ بھلا تنہا زندگی کب تک اور کس طرح گزارو گی؟'' وہ پُرسوچ انداز میں بولیں۔

''میں تنہا کہاں ہوں انا بی! آپ ہیں میرے ساتھ۔ پہلے سے اب زندگی انشاءاللہ اچھی گزرے گی۔ ہمیں اب یہ فکر نہیں ہوگی کہ کسی کو ہاتھ بھر کے رقم دینی ہے۔ تفکرات اور انتشار سے پاک زندگی ہوگی۔ اور شاید جینے کا مزہ بھی ہم محسوس کرنے لگیں گے کہ اپنا پیسہ ہم خود کھائیں گے۔'' زندگی میں پہلی بار انا بی نے اُسے کھل کر مسکراتے دیکھا تو خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگیں۔

☆☆☆

جس رات برستے ہیں ترے ہجر کے بادل
اس شب کو کہیں صبح کا تارا نہیں ہوتا
یوں ہی میرے پہلو میں چلا آتا ہے اکثر
وہ درد جسے میں نے پکارا نہیں ہوتا

شہریار نے اس کی جانب جھک کر بڑے دلنواز لہجے میں یہ اشعار پڑھے تھے۔

''آ گئے تم خبیث روح! کم از کم مجھے شعروں کی مار نہ مارا کرو۔''

''جو خود کسی کی محبت میں مرگیا ہو، اس مرے ہوئے کو کون مارے میری جان۔ ہوش میں آؤ یہ کیا تم نے حلیہ بنا رکھا ہے؟'' جواباً اس نے کہا۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہاں بیٹھنا ہے تو خاموش بیٹھو ورنہ دفع ہو جاؤ۔''

ہے اختیار میں تیرے تو معجزہ کردے
وہ شخص جو نہیں میرا اسے مرا کردے

''پلیز شہریار! خاموش رہو۔ اس وقت تمہاری آواز مجھے گدھے کی آواز سے بھی زیادہ بُری لگ رہی ہے۔ اور تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے کہ تم آکر میری زندگی کو مزید عذاب بناؤ۔'' شانزل نے اسے بری طرح لتاڑ کر رکھ دیا۔

''تم نے یہ تنہائی، یہ گوشہ نشینی کس کے لئے اختیار کی ہے؟ اُس ہستی کے لئے جو پہلے سے کسی کی شریک حیات ہے، کسی کی عزت و آبرو ہے۔ جس نے کبھی تمہاری، تمہاری محبت کی، تمہاری دولت کی ذرا پرواہ نہیں کی۔ تمہارے ہر حربے، ہر کوشش، ہر خواہش کی بھرپور طریقے سے نفی کی۔ جس نے ہمیشہ تم سے یہ فاصلہ رکھا، تم سے گریزپا رہی اور تم جو کبھی خود کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے، آج اس لڑکی کی خاطر سب کو فراموش کئے صرف اور صرف اس کے پرائے وجود کے تصورات میں گم ہو۔ خود کو تسخیر کروایا بھی تو ایسی لڑکی سے جو پہلے ہی کسی کی ہو چکی ہے اور اپنی دنیا میں یقیناً خوش وخرم زندگی بسر کر رہی ہوگی۔ دن کے کسی بھی لمحے میں وہ تمہیں سوچتی بھی نہیں ہوگی۔ تم اس کی یادداشت سے محو ہو چکے ہوگے۔ یا اگر کبھی کوئی بھولی بھٹکی یاد ذہن کے کسی گوشے میں ابھرتی بھی ہوگی تو ایک بدکردار، پست ذہنیت، عیاش باس کا خیال ہی تمہارے بارے میں اس کی ہر سوچ کو نفرت آمیز کردیتا ہوگا.....''

''پلیز..... پلیز..... خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ..... خاموش۔''

اس کے وجود کو گویا کسی نے کانٹوں پر گھسیٹا تھا۔ وہ تڑپ کر چیخا تھا۔

''[illegible] خاموش نہیں ہوں گا شانی۔ سچ اسی لئے کڑوا ہوتا ہے کہ وہ سچ ہوتا ہے۔ اپنا

بویا خود کاٹنا پڑتا ہے۔ کیا تم نے وہ سب نہیں چاہا تھا جو میں کہہ رہا ہوں؟“

”میں جب اندھیرے کا مسافر تھا، شہری! بے تحاشا دولت اور بے جا اختیارات کا نشہ جب حد سے سوا ہو چکا تھا، دنیا مجھے اپنی مٹھی میں بند محسوس ہوتی تھی۔“

”اب کیا ہوا؟ دولت، اختیارات، وجاہت، خوبروئی تمہارے پاس ہی موجود ہیں۔ کیوں اتنے بیزار اور بدگمان رہنے لگے ہو؟“

”اب میں روشنی میں آ گیا ہوں۔ ضمیر کی عدالت میں کڑی سزا پا رہا ہوں اور میری مٹھی میں ندامت، پچھتاوے اور خجالت بند ہے۔ مجھے بے سکونی کی سزا دی گئی ہے اور مجھ سے پوچھو کہ اس سے بڑی سزا کوئی نہیں ہے۔ سکون سے بڑی راحت کوئی نہیں ہے۔ میری دولت، میرے اختیارات، میری وجاہت، میری خوبروئی کوئی میرے کام نہیں آئی۔ یہ سب دے کر بھی میں سکون حاصل نہیں کر سکوں گا۔“ اس نے بے کل لہجے میں کہا تو آگے بڑھ کر شہریار نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تمہیں انکل کا خیال کیوں نہیں آتا؟ ان کی سالوں کی پرورش، محبت اور پیار پر یہ چند روزہ محبت اتنی حاوی ہو گئی کہ تم ان کی محبت اور ان کی پریشانی کو بالکل فراموش کر بیٹھے۔ وہ باپ ہیں مگر ایک قابل فخر اور قابل تحسین باپ جو بچپن سے آج تک صرف تمہاری محبت میں شرابور رہے۔ دیکھو شانزل! باپ سب اپنی اولادوں کو چاہتے ہیں اور پیار کرتے ہیں مگر ایسے وقت میں جب سب کچھ اختیارات رکھتے تھے، تمہیں معلوم ہے نا تمہاری مما تمہاری پیدائش والے دن ہی فوت ہو گئی تھیں اس وقت بھی انکل کے پاس دولت و جائیداد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے دوسری شادی کر سکتے تھے۔ تمہاری دوسری ماں لا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ صرف تمہیں سوتیلی ماں سے بچانے کی خاطر انہوں نے شادی نہیں کی۔ حالانکہ کئی لوگوں نے اپنی بیٹیاں اس شرط پر دینے کی کوششیں کیں کہ وہ تمہیں سگی ماں سے بڑھ کر پیار دیں گی، تمہاری پرورش کریں گی مگر انکل کسی طور یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے کہ کوئی بھی لڑکی ان کے بیٹے کی دوسری ماں بن کر آئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر منفی اثر ڈالے۔ تمہاری

محبت میں انہوں نے اپنی خواہشات و امنگوں اور نوجوانی کے تقاضوں کو تمہاری مما کے ساتھ ہی دفن کر دیا اور تم پر ان کی دنیا ختم ہو گئی۔ ذرا سوچو، دیکھو اپنے اطراف میں۔ کون ایسا باپ ہے جو صرف ایک بیٹے کی خاطر اپنی خوشیوں اور جذبات کا گلا گھونٹ دیتا ہے جبکہ وہ صاحب حیثیت بھی ہو اور جوان اور سمارٹ بھی۔ ہمارے معاشرے میں تو مڈل کلاس کے لوگ جو پانچ چھ بچوں کے باپ ہوتے ہیں، کئی بہانے کر کے چھ ماہ میں ہی گھر بسا لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی جوانی و ازدواجی زندگی کی کئی بہاریں گزار چکے ہوتے ہیں، مگر میری جان! ہر باپ کی محبت نفس پر غالب نہیں آ سکتی۔ بے چارے انکل نے ایک ہی سال تو ازدواجی زندگی کا گزارا تھا۔ بچپن سے بڑی مشقت، محنت اور لگن و جانفشانی سے ایک ننھے سے پودے کی آبیاری کی تھی۔ اسے وقت کے سرد، گرم، آندھی، طوفان سے بچا کر رکھا تھا۔ اس درخت کے پھل دینے کا وقت آیا، اس کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں کچھ ستانے کا وقت آیا تو وہ سب محنت و مشقت فراموش کئے زمین بوس ہونے کو تیار تھا۔ بہاروں کی آمد سے قبل ہی خزاؤں کا شکار بن بیٹھا تھا۔ خود کو سنبھالو شانزل، خود کو سنبھالو۔ تم اپنی چند روزہ محبت کے سوگ میں باپ کی برسوں کی محبت کو بھلا بیٹھے ہو۔ کس قدر خود غرض و خود پرست ہو تم۔“

”یہ کس نے کہا کہ میں ڈیڈی سے محبت نہیں کرتا؟“ وہ سیدھا ہو کر چونک کر بولا۔

”تمہاری ان حرکتوں نے، اس گوشہ نشینی اور دنیا سے بیزاری نے۔ جب تم خضری کو پکارتے ہو، اس کے بنا مر جانے اور اس کی محبت کے بغیر زندہ نہ رہنے کی جب تم قسمیں کھاتے ہو تو شاید تم سوچ بھی نہیں سکتے جوان، اکلوتے، لاڈلے بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر وہ کتنے اپ سیٹ ہوتے ہیں۔ تمہاری فکر، تمہاری وجہ سے ان کا بزنس ہی نہیں بلکہ دل و دماغ دونوں بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ آخر تم کب خود فراموشی سے باہر نکلو گے؟“

شہریار جو کل شاہ زیب کے منہ سے یہ سب باتیں سن چکا تھا، اس نے پہلی بار، بہت پُر وقار و بارعب شخصیت رکھنے والے شاہ زیب کو جب بیٹے کی محبت میں روتے دیکھا تو بری طرح تڑپ اٹھا تھا۔ انہوں نے خصوصی طور پر اسے پاکستان بلوایا تھا کہ وہ شانزل کا

واحد دوست تھا۔ ان کی بے غرض اور سچی محبت پر اسے بہت رشک آیا، جب وہ بولے۔

''بیٹا شہریار! اگر وہ لڑکی شانی کی زندگی بن چکی ہے تو اس کی خوشی کی خاطر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر وہ لڑکی اپنے خاوند سے طلاق لے کر شانی کے نکاح میں آنا چاہے تو بخوشی اُسے بہو ماننے کو تیار ہوں، بشرطیکہ وہ لڑکی اپنی رضا و رغبت سے طلاق لے کر شانی کے نکاح میں آئے۔ زبردست ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ زبردستی کے بندھن کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔''

یہ رضامندی ان کی اس محبت کا ثبوت تھی جو وہ اس سے کرتے تھے۔ ورنہ عموماً اعلیٰ کیٹیگری سے تعلق رکھنے والے افراد کی سوچ اور طرزِ عمل بالکل متضاد ہوتا ہے۔ جبھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شازل کو راہِ راست پر لائے گا۔

''کیا میں ڈیڈی کو بہت تنگ کرنے لگا ہوں؟ میری وجہ سے پریشان ہیں؟'' وہ گویا خود سے مخاطب تھا۔

''شکر کرو میری جان، وہ تمہارے ڈیڈی ہیں جو تمہیں کچھ کہنے کی بجائے اس کی فکر میں لگ گئے ہیں کہ کسی طرح پیارے، لاڈلے، دلارے بیٹے کی خواہش پوری ہو جائے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا اور انکل کی جگہ والد صاحب تو یقین رکھو اب تک مجھے وہ قبر میں اتار کر قصہ پاک کر چکے ہوتے کہ کمبخت نے لڑکی پسند بھی کی تو وہ جو پہلے سے شوہر کو پیاری ہو چکی ہے۔'' شہریار اپنے والد کے لہجے کی نقل اتار کر بولا۔

''تم بار بار خضریٰ کا ذکر اس انداز میں کر کے اس کی توہین کر رہے ہو، جو میں کسی طور برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جس انداز میں تم اس کا ذکر کر رہے ہو۔ وہ بہت شریف و باحیا لڑکی ہے۔ اگر اب تم نے اس کا نام لیا تو میں کوئی لحاظ و مروت نہیں کروں گا۔'' اُس نے غصے سے کہا اور باتھ روم میں جا کر زور سے دروازہ بند کیا۔ شہریار نے بے ساختہ کانوں میں انگلیاں دے ڈالیں۔

✲✫✲

موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ جب وہ اپنی ساتھی ٹیچر کے ساتھ اسکول آف ہونے کے

بعد گیٹ سے باہر نکلی تو ہلکی ہلکی پھوار گرنی شروع ہو گئی تھی۔

''واصفہ! شاپنگ کل کر لیں گے اگر موسم درست رہا تو۔'' اس نے اپنے گرد چادر درست کرتے ہوئے کہا۔ واصفہ نے ایک نگاہ اوپر آسمان پر ڈالی پھر ہنس کر بولی۔

''گھبراؤ نہیں مائی ڈیئر! ہم کراچی والے اتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ بھرپور بارش کا مزہ لوٹ سکیں۔ یہاں تو بس یہ ہلکی پھلکی پھوار اور بوندا باندی آتش شوق بڑھا کر چلی جاتی ہے۔ ہمارے نصیبوں کے بادل تو دوسرے شہروں میں موسلا دھار برستے ہیں۔''

''پھر بھی احتیاط لازم ہے۔ کیا معلوم آج یہ ہماری حسرتیں دھو ڈالے۔''

''جب ہو گی، تب دیکھی جائے گی۔ فی الحال شاپنگ کو چلنا ہے تو بس چلنا ہے۔ مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔ اور پرسوں میرے منگیتر کی برتھ ڈے ہے۔ کم از کم ایک دن پہلے تو اس کے لئے گفٹ خریدنا اس کا حق بنتا ہے نا؟ چلو، میں ناں نہیں سنوں گی۔'' قریب سے گزرتی ییلو کیب کو روکتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف بڑھ گئی۔

واصفہ حیدر سے اس کی دوستی اسکول جوائن کرنے کے چند دنوں بعد ہو گئی تھی۔ وہ بہت شوخ و چنچل اور پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کا تعلق اعلیٰ فیملی سے تھا۔ وہ شوقیہ جاب کر رہی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کا کریز تھا اور اکثر کوشش کرتی تھی کہ خضریٰ بھی اس کا ساتھ دے۔ مگر خضریٰ بہت کم اس کا ساتھ دیتی تھی۔ کل وہ خود گھر جا کر انا بی سے اجازت لے آئی تھی۔ انا بی کی تو دلی خواہش تھی کہ خضریٰ خوش رہے۔ لوگوں سے ملے، گھومے پھرے، زندگی کی رنگینیوں کو محسوس کرے۔ انہوں نے بخوشی اجازت دی اور ساتھ ہی خضریٰ سے چھپ کر کہہ دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھا کرے اور جہاں چاہے لے جایا کرے۔ انہیں اس پر اعتماد تھا۔

واصفہ نے پورا شاپنگ سینٹر کھنگالنے کے بعد پرفیومز، شرٹ اور دو شاعری کی بکس خریدی تھیں۔ گفٹ پیک کروا کر باہر آئیں تو اچھی خاصی موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی تھیں۔

''واہ، بیوٹی فل! کیا آفت موسم ہو رہا ہے۔'' اس نے گلاسز ہاتھ میں لیتے ہوئے

جھوم کر کہا۔

''تمہیں موسم کی خوبصورتی بھا رہی ہے ایڈیٹ! مجھے فکر ہو رہی ہے اگر بارش تیز ہو گئی تو کس طرح گھر جائیں گے؟ اس موسم میں رکشہ ٹیکسی والوں کے مزاج ویسے بھی آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔'' خضریٰ پریشانی سے بولی تھی۔

''تیر کر پہنچ جائیں گے، فکر نہ کرو۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔''

''پہلے ''پیزا ہٹ'' سے پیزا اور کافی پر ہاتھ صاف کریں گے۔ اگر ٹیکسی نہ بھی ملی تو بے فکر رہو، موبائل ہے میرے پاس، گھر سے گاڑی منگوا لوں گی۔'' اسے پریشان دیکھ کر کہا۔

''میں کوئی کافی وافی نہیں پیوں گی۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ انابی انتظار کر رہی ہوں گی اور شام کو بچے بھی آ جائیں گے ٹیوشن پڑھنے۔''

''انابی کو معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ ہو اور تمہارے بچوں کے آنے سے قبل میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔'' حسب عادت وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پیزا ہٹ کی جانب بڑھ گئی۔

بات تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دم
ہاتھ کو ہونٹوں پر رکھ کے روکنا اچھا لگا
چائے میں چینی ملانا اس گھڑی بھایا بہت
زیر لب وہ مسکراتا شکریہ اچھا لگا

اچھی آواز اور شوخ لہجے پر اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ قریب ہی بلیک پینٹ اور زرد ٹی شرٹ میں خاصا اسمارٹ نوجوان کھڑا بڑی مسکراتی نگاہوں سے کافی میں چینی ملاتی واصفہ کو دیکھ کر وہ شعر پڑھ رہا تھا۔

''اوہ، شہری تم کیوں پیچھا کر رہے ہو میرا؟'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''کیا کروں؟ کسی اور کا پیچھا کرتا ہوں تو تمہیں ہی اعتراض ہوتا ہے۔'' وہ بے تکلفی

سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور اس کے آگے سے کافی کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''کر کے دکھاؤ کسی اور کو فال۔ اپنی اور تمہاری جان ایک نہ کر دوں تو۔''

''اللہ رحم فرمائے میرے مستقبل پر۔ کس قدر ہٹلر ٹائپ وائف ملی ہے۔''

''وائف! دماغ درست ہے تمہارا۔ کیا بول رہے ہو؟'' وہ اتنی زور سے چیخی کہ آس پاس بیٹھے لوگ ادھر دیکھنے لگے۔

''سوری۔ میرا مطلب ہے فیوچر میں تو تم مری وائف ہو ہی نا۔''

''چلیں......؟ دیر ہو رہی ہے۔'' خضریٰ ان دونوں کو الجھا دیکھ کر گویا ہوئی۔

''اوہ شٹ، دیکھو یہ بندہ ایسا ہی ہے۔ اس کی موجودگی میں ہر شے فراموش ہو جاتی ہے بلکہ اس کی بک بک میں، میں تعارف کروانا ہی بھول گئی۔ یہ شہریار ہیں، میرے منگیتر۔''

''پلیز، اب تو میرا کچھ ادب کر لیا کرو۔ کس قدر بدتمیزی سے بول رہی ہو۔ آخر کار تمہارا ہونے والا سرتاج ہوں، عزت کیا کرو میری۔'' وہ جل کر بولا۔

''ہونے والے ہو...... ہوئے تو نہیں۔ جب ہو گے تو عزت بھی ہو جائے گی۔''

''آہ بڑے بے آبرو تیرے کوچے میں آ کر ہم ہوئے۔'' ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے شعر ترتیب دیا۔ واصفہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ ان دونوں کے درمیان ہونق بنی بیٹھی تھی۔

''شہری! ان سے ملو، یہ میری بیسٹ فرینڈ ہے۔ خضریٰ...... خضریٰ حیات۔''

شہریار کو ایسا لگا جیسے اس کے دماغ میں دھماکا سا ہوا ہے۔ وہ آج کل اسی نام کے بھنور میں تو الجھا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ نگاہیں اٹھا کر خضریٰ کی جانب دیکھا تھا۔

گلابی مائل سفید رنگت، ستواں ناک اور سحر انگیز چہرے کے نقوش، ڈارک براؤن چمکتی ہوئی آنکھوں پر گرتی، اٹھتی، گھنیری پلکوں کی جھالریں، متناسب سراپا اور سیاہ چادر میں لپٹا ہوا چہرہ بہت پُروقار و پُرتقدس لگ رہا تھا۔

''کیا یہ وہی لڑکی ہے جس نے شازل جیسے سرپھرے کی زندگی بدل کر رکھ دی ہے؟ کیا ضروری ہے یہ وہی لڑکی ہو؟ کیا اس نام کی واحد لڑکی اس پورے شہر میں ہے؟ لیکن

میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اس کی سنجیدگی و تمکنت، سادہ و پُروقار انداز، دلربا و معصوم حسن، دلکش و دلفریب سراپا۔''

''میں کچھ پوچھ رہی ہوں...... جواب کیوں نہیں دے رہے؟'' واصفہ کی آواز نے اسے چونکایا۔

''کک...... کیا؟ کیا پوچھ رہی ہو؟'' وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''تم یہاں کیوں آئے؟ آئی مین تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟''

''اب تم اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ تمہاری زلفوں کی مہکار نے مجھے یہاں کا راستہ بتایا یا میرے دل نے تمہیں پکارا۔ بلکہ میں تو یہاں کافی پینے کے لئے آیا تھا، جب تم پر نظر پڑی تو ادھر چلا آیا۔'' وہ شرارت سے ہنس کر بولا تو واصفہ کا منہ بن گیا۔

''کیسی ہیں آپ مس خضریٰ! نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔'' وہ براہِ راست خضریٰ سے مخاطب ہوا اور بات بنا کر بولا۔

''جی ہاں۔ یہ ان کی بہت پرانی بیماری ہے بلکہ لاعلاج بیماری ہے کہ ہر حسین چہرے کو دیکھ کر انہیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔'' واصفہ نے فوراً بدلہ لیا تھا۔

''اچھا۔'' اُس نے آہستگی سے مختصر جواب دیا۔

''پھر تو آپ کو جگہ بھی یاد ہوگی جہاں آپ نے انہیں دیکھا تھا۔'' واصفہ کو بھی اسے چڑانے میں سرور محسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ نادانستگی میں وہ اس کی اُلجھن سلجھا رہی تھی۔

''ہوں، شاید۔ میں نے خضریٰ جی کو کچھ عرصے قبل شانزل گروپ آف انڈسٹریز کی ایک برانچ میں دیکھا تھا۔'' اُس نے گہری کھوجتی نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور اس نام پر اُس کے پُرسکون چہرے پر پھیلتے رنگ دیکھ کر اسے اپنے گمان پر یقین ہونے لگا۔

''جی ہاں۔ میں وہاں جاب کرتی تھی مگر اپنے کام سے کام رکھتی تھی، اس لئے شاید آپ کو نہ دیکھ پائی۔'' اس کے لہجے میں اضطراب اور گھبراہٹ تھی۔

''ارے وہ تو بہت بیسٹ جاب تھی۔ کیوں چھوڑ دی آپ نے؟''

''پلیز واصفہ! چلو، بچے ٹیوشن پڑھنے آگئے ہوں گے۔ بلاوجہ چھٹی ہوگئی تو اس طرح بچوں کے ذہن بھی خراب ہوں گے اور میری ریپوٹیشن بھی۔'' اس کا سوال قصداً نظر انداز کر کے وہ کھڑی ہوگئی۔ واصفہ کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

انہیں ڈراپ کرنے کی ذمہ داری اس نے لے لی اور خضریٰ کے انکار کے باوجود اسے گھر ڈراپ کر کے گیا۔ اس میں اس کے دو مقاصد تھے۔ اول اس کا گھر دیکھنا اور دوم جلد ہی وہاں تنہا آ کر شانزل کی کیفیت بیان کرنا اور ساتھ ہی یہ درخواست کرنا کہ وہ کسی طور شانزل کو سمجھائے کہ وہ اسے بھلا کر اپنی نئی زندگی شروع کرے۔

''کیسی لگی تمہیں میری دوست؟'' واصفہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''نائس۔ بہت کم گو اور سنجیدہ ہے۔ تمہاری دوستی کیسے ہوگئی؟''

''تمہیں معلوم ہے نا سچے اور پُرخلوص لوگ میری کمزوری ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی ہے۔ میری ہم عمر مگر بے چاری کے ساتھ بہت بڑی ٹریجڈی ہوگئی ہے۔'' واصفہ کے لہجے میں افسردگی اور دُکھ تھا۔

''کیسی ٹریجڈی؟ کیا ہوا ہے؟''

''چھ ماہ قبل ایک ایکسیڈنٹ میں اس کا ہسبنڈ ہلاک ہوگیا ہے۔''

''واٹ......؟'' لمحے بھر کو اسٹیئرنگ اُس کے ہاتھ سے بہکا تو کار بری طرح لہرا گئی۔

''ریلی۔ جب میں نے سنا تھا مجھے بھی اس قدر ہی افسوس ہوا تھا۔''

''میرا تو فرطِ مسرت سے ہاتھ کانپ اٹھا تھا محترمہ!'' اُس نے دل میں سوچا۔

''پہلے تو میں اسے بیچلر ہی سمجھی تھی، جب اس نے بتایا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ بیوہ ہے اور کافی دنوں تک مجھے افسوس رہا۔ مگر ایک دن انابی نے اس کی ساری اسٹوری سنائی تو میرے دل نے کہا کہ ایسے دھوکے باز اور لالچی شخص کا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔''

''کیا بتایا تمہیں اس کی انابی نے؟''

واصفہ انابی کی زبانی سنے تمام حالات اُسے بتانے لگی۔

☆☆☆

''سچ، وہ لڑکی بہت مظلوم اور شریف ہے۔'' شاہ زیب صاحب اُس کی زبانی خضریٰ کے متعلق جان کر سخت افسردہ ہوئے تھے۔ واصفہ کی زبانی اس کے حالات سن کر وہ اسے ڈراپ کر کے رُکا نہیں تھا سیدھا ان کے آفس چلا آیا تھا۔

شانزل سے پہلے اس نے انکل سے بات کرنا مناسب سمجھی تھی جس کا انہوں نے گرمجوشی سے مثبت جواب دیا تھا۔

''کبھی سنا تھا بہترین دوست اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ آج تم نے یہ بات سچ کر دکھائی۔ تمہاری بے غرض اور پُرخلوص دوستی اور محبت نے اپنے دوست کو جینے کی راہ دکھائی ہے۔ پراؤڈ آف مائی سن!'' انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

شہریار نے اس کٹھن وقت میں ان کا دل و جان سے ساتھ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ اس کی دوستی بے مثال و قابل فخر و ستائش ہے۔

ادھر اس نے ان کے آنسو پونچھے تھے تو اُدھر شانزل کو کمرے سے کھینچ لایا تھا۔ چاہے وقتی طور پر یا محض دکھاوے کے لئے ہی سہی، وہ گوشہ نشینی سے باہر نکل کر بزنس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کافی وقت گزارنے لگا تھا۔

''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں، آپ کی اور شانزل کی محبت کے آگے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بتائیں وہاں کب چلیں گے؟'' وہ ان سے علیحدہ ہو کر بولا۔

''جب آپ مناسب سمجھیں۔ اگر ابھی کہیں تو ابھی چلتے ہیں۔''

''انکل! کیا آپ صدق دل سے خضریٰ کو بہو بنا کر لائیں گے یا محض بیٹے کی نگاہوں میں اپنی پرسٹیج بڑھانے کے لئے اسے وقتی طور پر لے آئیں گے تاکہ عام با حیثیت لوگوں کی طرح بعد میں اس غریب لڑکی کو منظر سے آؤٹ کر کے اپنی حیثیت کی بہو لے کر آئیں؟''

''اللہ گواہ ہے، میرے دل میں ایسی کوئی گھناؤنی سازش نہیں ہے۔ بلکہ میں اب سمجھا

ہوں کہ اس گھر کو ایک مخلص و باوفا بیوی اور بیٹی کی ضرورت ہے۔ یہ فرائض صرف ایک تہذیب یافتہ مڈل کلاس لڑکی ہی نبھا سکتی ہے۔ ہماری کلاس کی لڑکیاں گھر اور گھر داری سنبھالنے اور رشتے ناتوں کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔''

''آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا انکل! میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ لڑکی خضریٰ شانزل کے بارے میں اچھی رائے اور اچھے خیالات نہیں رکھتی۔ پہلے میں واصفہ کے ذریعے ان کی بزرگ گارجین اماں بی سے گفتگو کر کے انہیں راضی کروں گا، اس کے بعد آپ کو لے کر چلوں گا۔ بلکہ ہم پرپوزل لے کر جائیں گے۔'' اس نے پُرعزم لہجے میں کہا پھر چونک کر بولا۔ ''انکل! ابھی یہ ساری کارروائیاں شانزل سے سیکرٹ رکھی جائیں گی۔ جب سب معاملات طے ہو جائیں گے تو بالکل عین موقع پر ہم اسے سرپرائز دیں گے۔''

☆☆☆

''ارے میاں! یہ تو وہی بات ہوئی کہ کنوئیں سے بچے تو کھائی آگے آ گئی۔ جس شخص کو میری بچی چند ماہ برداشت نہ کر سکی اس شخص کے ساتھ ساری زندگی کس طرح گزار سکتی ہے؟ اور پھر آدمی بھی بدکردار اور بدچلن۔ نہ بابا، معاف کرو۔ کم از کم اس چیونٹیوں بھرے کباب سے میری بچی کو دور رکھو تو بہتر ہے۔ لو بھلا، ایک عذاب سے چھٹی تھی کہ پھر......''

''معزز خاتون! خدارا میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ شانزل خان اب بالکل بدل گیا ہے اور اسے بدلنے میں خضریٰ کی خوش نصیبی شامل رہی ہے۔'' شہریار ان کی بات قطع کر کے عاجزی سے گویا ہوا۔ واصفہ نے ساری بات سن کر مشورہ دیا تھا کہ وہ اماں بی کو راضی کر لے تو خضریٰ کو راضی وہ خود کر لیں گی۔ سو آج وہ اس وقت ان کے روبرو تھا اور دلائل کے ذریعے انہیں قائل کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔

''میری دعا ہے اللہ اسے اور ہدایت نصیب کرے، اسے اچھا اور پکا مسلمان بنائے۔ بس اس سے زیادہ ہم اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔'' وہ پلنگ سے اٹھتے ہوئے نروٹھے

پن سے بولیں۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کا مزید وقت نہیں لوں گا۔ صرف میری چند باتیں سن لیجئے۔ خضریٰ کے سر پر باپ اور بھائی کا تحفظ نہ تھا تو اس کی زندگی کتنی کٹھنائیوں سے گزری، شانزل بھی بچپن سے ماں اور بہن جیسے رشتوں کے مقدس آنچل سے محروم رہا تو کردار میں جھول آ گیا جس میں زیادہ تعلق اس کے ماحول اور تنہائی کا تھا۔

خاوند نہ ہو تو عورت ماں اور باپ دونوں کا فرض نبھا دیتی ہے مگر مرد یہ ذمہ داریاں بھرپور طریقے سے نہیں نبھا سکتا۔ وہ صرف باپ کا ہی رول پلے کر سکتا ہے۔ شانزل نے برائی اور گناہ کی راہیں چھوڑ کر نیکی اور اچھائی کی راہ پر چلنے کا عزم کیا ہے اور آپ کو معلوم ہوگا کہ بندے برائی کی جانب جلد راغب ہو جاتے ہیں بہ نسبت نیکی و اچھائی کی راہ پر چلنے کے۔ اگر کوئی مخلص و ہمدرد محبت کرنے والی ہستی کی رہنمائی اور ساتھ مل جائے تو ڈگمگاتے قدم مضبوط ہو جاتے ہیں۔ کسی بھولے بھٹکے کو نیک راہ پر چلانا کتنے ثواب و نیکی کا کام ہے، یہ آپ بہتر جانتی ہیں۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن کل آپ کا جواب سننے ضرور آؤں گا۔ آپ فیصلہ کر لیجئے گا کہ کسی کو پُرخلوص سہارا دے کر اپنی آخرت سنوارنے کا نیک کام کریں گی یا اسے دوبارہ گناہوں کی دلدل میں غرق ہونے کے لئے بے اعتنائی برتیں گی۔"

وہ رُکا نہیں اور انہیں گومگو کی کیفیت میں چھوڑ کر چلا گیا۔

نیکی اور ثواب کے نام پر ان کے اندر ہلچل سی مچ گئی تھی اور یہ کشمکش ان کے اندر پھیلتی ہی چلی گئی اور یہ کیفیت خضریٰ سے مخفی نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے انا بی؟ جب سے اسکول سے آئی ہوں آپ کو پریشان دیکھ رہی ہوں۔" وہ ان کے قریب بیٹھ کر استفسار کرنے لگی۔

"رشتہ آیا ہے تمہارا۔" انہوں نے چھپانا فضول سمجھا کہ وہ کل بھی آنے کو کہہ گیا تھا اور کب تک وہ اس سے اس موضوع پر بات نہ کرتیں۔

"رشتہ؟ کہاں سے؟" وہ بے ساختہ ہنس کر گویا ہوئی۔

"تمہارے پاس، شانزل خان سے۔" وہ اُس کی جانب بغور دیکھتی ہوئی بولیں۔

"واٹ!...... کون آیا تھا؟" اُس کے جسم میں گویا چنگاریاں چمٹ گئی تھیں۔

"اُس کا دوست۔ شہریار نام بتایا تھا اس نے۔"

"اُس ذلیل کمینے شخص کی یہ ہمت..... آپ نے بے عزت کر کے نکالا ہوتا اُسے۔"

"وہ کہہ رہا تھا، وہ تمہارا پاس بالکل سدھر گیا ہے۔ شریفانہ زندگی گزار رہا ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا اس شخص کے بارے میں۔ اب کوئی آئے تو دھکے دے کر نکالیے گا یہاں سے۔ اونہہ..... کیا سمجھتا ہے خود کو۔" غصے سے اس کا برا حال تھا۔

✻✩✻

"میں چلوں گا تمہارے ساتھ بیٹے! اور انہیں راضی کر کے ہی آؤں گا۔" شہریار سے تمام صورت سن کر وہ پریشان لہجے میں بولے۔

"بڑے صاحب..... بڑے صاحب! دیکھئے چھوٹے صاحب آنکھیں نہیں کھول رہے اور بخار بہت تیز ہے۔" اسی دم عارفین اندر سے دوڑا ہوا آیا اور بدحواسی سے بولا تو شاہ زیب صاحب اور شہریار دونوں ہی آگے پیچھے اُس کے بیڈروم کی طرف بڑھے تھے جہاں بیڈ پر وہ بے سدھ پڑا تھا۔

"شانی..... شانی!" شاہ زیب صاحب بے قراری سے اس پر جھکے پکار رہے تھے۔

اس کی بیہوشی محض ایک بہانہ ثابت ہوئی۔ وہ بستر سے پھر اٹھا ہی نہیں۔ اُس کی سرخ و سپید رنگت چند ہفتوں میں ہی زرد ہو گئی۔ چہرے کی شادابی و تازگی کم ہو گئی۔ شاہ زیب صاحب ہر وقت اس کے سرہانے موجود رہتے۔ انہیں اپنی اور بزنس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھا۔ اُس کا مکمل چیک اپ ہوا۔ کئی ٹیسٹ ہوئے۔ آخر کار اُس کی ماضی کی کثرتِ شراب نوشی و سگریٹ نوشی نے اثر دکھایا تھا۔ ڈاکٹرز کے بورڈ نے یہ جان لیوا خبر سنا دی کہ وہ پھیپھڑوں کے عارضے میں مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری تھی اور وہ اندر سے بالکل ہی ڈھے گئے تھے۔

"حوصلے سے کام لیں انکل! آپ تو بہت ہمت اور حوصلے والے ہیں۔"

''جوان بیٹے کو موت کی طرف بڑھتے دیکھ کر میرے تمام حوصلے ٹوٹ گئے ہیں، میں کیا کروں؟ کہاں سے درد و تکلیف سے تڑپتے بیٹے کو دیکھنے کا حوصلہ لاؤں؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

''پلیز، خود کو سنبھالیے۔ اگر شانزل آپ کو اس طرح دیکھ لے تو کیا دُکھی نہیں ہو گا؟'' شہریار اپنے آنسو بمشکل ضبط کرتا بھرائی آواز میں انہیں دلاسے دینے لگا۔

''سر! روم میں آپ کو شانزل صاحب بلا رہے ہیں۔'' معاذرس نے آ کر اطلاع دی۔

''آپ جاؤ بیٹا! میں کچھ دیر میں منہ دھو کر آ رہا ہوں۔'' وہ تیزی سے رومال سے بھیگا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولے تو وہ پرائیویٹ رومز کی طرف چل پڑا۔

''تنگ آ گئے نا میری تیمارداری سے۔ اس لئے کہتا ہوں گھر بھی چلے جایا کرو۔'' اُسے اندر آتے دیکھ کر شانزل جو تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا، مسکرا کر بولا۔

''میں چلا جاؤں اور تم خوب بدپرہیزی کرو۔'' شہریار چیئر پر بیٹھ کر بولا۔

''اب کیا بدپرہیزی اور کیا پرہیز، دن ہی کتنے ہیں یار۔ اب تو نہ ٹوک مجھے۔'' وہ ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو شہریار بری طرح چونک پڑا۔

''کیا..... کیا مطلب؟'' وہ بری طرح سٹپٹا کر گویا ہوا۔

''میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو سمجھ نہ سکوں کہ مجھے جو ٹریٹمنٹ دی جا رہی ہے، وہ کس پچویشن میں دی جاتی ہے اور رپورٹس فائل کو میں تمہاری غیر موجودگی میں اسٹڈی کر چکا ہوں۔'' اُس کا لہجہ نارمل تھا جیسے بہت پہلے وہ اس حقیقت سے روشناس ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں میں کئی ٹوٹے ستاروں کی کرچیاں تھیں۔ کوئی محرومی، کوئی خلش، کوئی ملال درد بن کر ان کرچیوں سے جھلک رہا تھا۔

شہریار جس نے خود پر ضبط کے پہرے لگائے تھے، اس پُرسکون چہرے کی متوحش، بے قرار آنکھوں کا درد اُس کے دل کا درد بن کر اٹھا تھا۔ وہ اس سے لپٹ کر بری طرح رو دیا۔

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ پلیز خود کو سنبھالو۔ اگر تم ہمت کھو

دو گے تو ڈیڈی کو کون سنبھالے گا؟ میرے بعد تم کو ہی.....''

''خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔ نہیں کرو ایسی باتیں۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں..... کچھ نہیں ہو گا۔ بیماری کتنی ہی خطرناک ہو مگر وہ انسانی ول پاور سے زیادہ اسٹرونگ نہیں ہوتی میری جان۔ تم میں بھرپور اسٹیمنا ہے، غضب کی قوت مدافعت رکھتے ہو۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔ جس کا جتنا وقت لکھا ہوتا ہے وہی سانسیں اسے گزارنی ہوتی ہیں۔ میں تو بہت گناہ گار بندہ ہوں۔ عمر کا ہر پل بے خبری اور غفلت میں گزارا ہے، اب تو شاید توبہ بھی قبول نہیں ہو گی میری۔''

''نہیں کرو..... نہیں کرو ایسی بھیانک باتیں۔ اللہ کے کرم سے نا امید نہ ہو۔ انکل نے امریکہ میں کئی اسپیشلسٹ کے پاس تمہاری رپورٹس بھیجی ہیں۔ ان کا آج جواب آ جائے گا تو انکل تمہیں علاج کے لئے وہاں لے جائیں گے۔ بہرحال وہاں ہمارے مقابلے میں آسانیاں زیادہ ہیں۔''

''سنو..... موت مقدر بن گئی تو سمجھو بن گئی۔ دنیا کا کوئی ملک موت سے نہیں بچا سکتا۔ ایک زندگی میں نے اپنے وطن سے دور گزاری ہے۔ مرنا میں اپنے وطن میں ہی چاہوں گا۔'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''تم اتنے کٹھور کیوں بن گئے ہو؟ کیا تمہیں ہماری محبتوں کا ذرا بھی احساس نہیں؟''

''بہت ہے۔ لیکن ڈیڈی سے کہہ دینا میں علاج کی خاطر کہیں نہیں جاؤں گا۔''

کمرے میں دبیز اُداسی پھیل گئی تھی۔ گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

شانزل آنکھوں پر بازو رکھے خاموش لیٹا تھا۔ نامعلوم اس وقت اُس کے کیا جذبات تھے۔ شہریار کو اُس کی غیر معمولی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ پکار اٹھا۔

''شانی..... شانی..... شانزل!'' وہ گھبرا کر متوحش انداز میں اس پر جھکا۔

''زندہ ہوں۔ اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں یار۔'' وہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر مسکرا کر گویا ہوا۔

''شٹ اپ، کوئی حق نہیں پہنچتا تمہیں اس طرح ہمارے جذبات کو ٹیز کرنے کا۔''

اُس کی جھنجلاہٹ پر شازل نے قہقہہ لگایا تھا مگر درد کی تیز لہر میں قہقہہ دب کر رہ گیا۔

☆☆☆

''بہن جی! اللہ کے بعد میرے بیٹے کی زندگی آپ کی بیٹی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے واسطے میرے بیٹے کی زندگی بچالیں۔ اس پر رحم کھائیں۔ میں خضریٰ بیٹی کے نام اپنی تمام دولت وجائیداد لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ صرف وہ مجھے میری اصل دولت لوٹا دے۔ اس کی ایک ہاں میرے بیٹے کو واپس پلٹنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ ایک نہیں، دو زندگیاں بچالے گی۔ میں تاحیات اس کا مشکور رہوں گا۔ تمام عمر اسے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ اس پر اس کی حکمرانی ہوگی۔''

وہ دولت مند سیٹھ جس کی حیثیت و امارت کا ایک جہاں میں ڈنکا بجتا تھا، آج تیسری مرتبہ اس معمولی، جگہ جگہ سے ادھڑے فرش والے صحن میں اپنی تمام حیثیت و مرتبہ بھلائے بیٹھا اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا جس کے سرونٹ کوارٹرز بھی اس جگہ سے بہترین وقیمتی تھے مگر اپنے سینے میں لگی آگ کے آگے اسے یہ بے حیثیت گھر دنیا کی واحد جائے پناہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی بے کس و مجبور کی طرح اس کی منت و سماجت کر رہے تھے اور آج پوری شدت سے انابی کو ان کا درد، تکلیف اور دُکھ محسوس ہو رہا تھا۔

''بھائی صاحب! شرمندہ نہ کیجئے۔ اللہ آپ کے بیٹے کو ہزاروں سال زندہ رکھے۔ ہم تو بہت ہی بے حیثیت اور غریب لوگ ہیں۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کبھی نہیں سجتا۔ یہ دنیا ایک کھیت کی مانند ہے۔ یہاں جو انسان بوتا ہے، وہی کل کاٹتا ہے۔ آپ کے بیٹے کی حالت، اس کی بیماری، اس کی لاپرواہی اور مجرمانہ غفلت کا شاخسانہ ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی، جب وہ سن بلوغت کو پہنچ جائیں تو قدم قدم پر ان کی نگرانی اور رہنمائی کرنی چاہئے۔ مگر آپ جیسے دولت والے ان باتوں کو فرسودگی اور جہالت گردانتے ہیں اور وقت آنے پر اسی طرح سر پر ہاتھ رکھ کر روتے ہیں۔''

''مجھے اعتراف ہے یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن اگر گھر میں کوئی بہن یا ماں ہوتی تو وہ ہرگز نہ بگڑتا۔ گھر کی تنہائیوں سے گھبرا کر اس نے کلب جانا شروع کیا اور میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ اب باشعور اور سمجھدار ہو گیا ہے اور میں بزنس میں مگن ہو گیا۔ پھر جان بوجھ کر میں سب کچھ نظر انداز کرتا رہا کہ یہ سب نوجوانی کے شغل ہیں، خود ہی وقت آنے پر چھوٹ جائیں گے۔ مگر ایسا ہو جائے گا، مجھے معلوم نہ تھا۔''

''روپیہ ہر برائی کی جڑ ہے۔ اور پھر ان لوگوں کا تو کوئی دین ایمان ہی نہیں رہتا جو غیر ملکوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کے جنون میں مذہب کے حقوق، شریعت کے فرائض سب بھول کر مسلمان ہو کر بھی غیر مسلموں کے طور طریقے اپنا لیتے ہیں۔ آج آپ اس دولت کو ایک غیر لڑکی کے نام کر دینے کو تیار ہیں جس دولت کو پانے کے لئے آپ نے اپنے مذہب سے خود کو بھی دور رکھا اور بیٹے کو بھی محروم رکھا اور آج آپ پھر بھی خالی ہاتھ ہیں۔ سونے کے محل، ہیروں کی چمک، کچھ بھی آپ کے کام نہیں آ رہی۔ دنیا میں آپ اتنے تہی دست ہیں تو آخرت میں کیا ہوگا؟''

''میں شرمندہ ہوں، پشیمان ہوں اپنے رب سے۔ میں نے توبہ کر لی ہے اور ساتھ ہی اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کا عہد بھی کر چکا ہوں۔ کیا میرے جاں بہ لب بیٹے کی خطائیں خضریٰ بیٹی معاف نہیں کر سکتی؟'' وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولے۔

''میں کوشش کروں گی بھائی صاحب کہ کسی طور وہ مان جائے۔'' انابی دھیمے لہجے میں بولیں تو وہ اٹھ کر شکستہ قدموں سے گھر کی دہلیز پار کر گئے۔

''اب جو ہونا تھا، وہ ہو چکا بیٹی۔ جب کوئی خطا کار اپنی غلطی مان لے، سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ ہم تو خود خطا کار اور گناہگار بندے ہیں پھر بھلا ہماری کیا اوقات کہ ہم کسی کو معاف نہ کر سکیں۔ سب بھلا دو میری بچی۔ ہاتھ تھام لو اس بچے کا جو خود اپنے ہاتھوں موت کی دہلیز پر پاؤں رکھ چکا ہے۔'' انابی نے شاہ زیب صاحب کے جانے کے بعد اندر کمرے میں بیٹھی سب سنتی ہوئی خضریٰ کو جا کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں انا بی۔ پہلے میں نے آپ کے اور امی کے سامنے سر جھکا دیا تھا مگر اب میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں سنوں گی۔ اس شخص کا ساتھ تو مجھے بالکل گوارا نہیں ہے۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اللہ کے قہر و غضب سے ڈر۔ مت کسی مجبور و پریشان کا امتحان لے۔ وہ کروڑ پتی آدمی صبح شام ہماری دہلیز پر آتا ہے کسی بھکاری کی طرح فریاد کرتا ہوا۔ کتنا سخت وقت اس پر آیا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے تمہاری یہ ہٹ دھرمی ہمیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ مان جا بیٹی! تیرا ساتھ اسے خوشیوں کی طرف، زندگی کی طرف لوٹا دے تو کیسا ثواب کا کام ہوگا۔ اور پھر خود سوچو۔ تم اس طرح کب تک تنہا زندگی گزارو گی؟ میرا ساتھ تو بہت ناتواں اور بودا ہے۔ عمر گزار چکی ہوں۔ کبھی بھی سانس کی ڈوری کٹ سکتی ہے۔“

”کسی کی خاطر آپ خود کو مت کوسیں انا بی۔“

”میں سچ بیان کر رہی ہوں بیٹی! زندگی بڑی دغا باز ہوتی ہے۔ کب دغا دے جائے کسی کو معلوم نہیں۔ کوئی بھی انسان ماں کے پیٹ سے چور، ڈاکو، آوارہ، بدکردار پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ حالات اسے اپنے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ شانزل کو بگاڑنے میں بھی یہی حالات تھے۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے سر پر ماں کا سایہ نہ تھا اس لئے وہ اس قدر بگڑ گیا۔ مگر دیکھو جب اس نے اصل حیا اور عورت کا وقار دیکھا تو اس نے توبہ کر لی۔ اسیر ہو گیا تمہارا۔ پابند کر لیا خود کو تمہارے لئے۔“

”یہ سب اپنی جگہ درست ہے۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔“

”اونہہ...... مانتی رہو اپنے دل کی۔ جب قت گزر جائے گا تو پچھتاوے رہ جائیں گے۔ اور یہ بات گرہ میں باندھ لو، تنہا عورت معاشرے میں سہولت سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور بی، تم بیوہ ہو، بے شک ازدواجی زندگی کا ایک لمحہ بھی تم نے نہیں گزارا۔ مگر لوگ جانتے ہیں کہ تم بیوہ ہو۔ اگر بھولے بھٹکے کسی نے اپنانے کی خواہش ظاہر بھی کی تو وہ کوئی رنڈوا ہوگا یا دوسری شادی کا کوئی شوقین یا پھر کوئی نشے باز۔ کسی اچھے گھرانے سے رشتہ آنے کا تو تصور بھی نہیں ہے۔“ اس کے مسلسل انکار نے انہیں مشتعل کر ڈالا تھا۔

خضریٰ نے کچھ کہا نہیں۔ گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ انہیں خود ہی اس پر پیار آ گیا تو کچھ توقف کے بعد اس کے قریب بیٹھ کر گویا ہوئیں۔

”تم نے خود ہی تو مجھے سب کچھ بتایا۔ حتیٰ کہ گاؤں جانے والی بات بھی کچھ عرصہ چھپانے کے بعد بتا دی۔ ہمارا رشتہ ہی ایسا ہے کہ ہم اگر ایک دوسرے سے کوئی بات چھپانا چاہیں تب بھی نہیں چھپا سکتے۔ خود سوچو اگر وہ فطرتاً عیاش ہوتا تو اسے تو بارہا ایسے مواقع ملے تھے کہ وہ اپنی من مانی کر سکتا تھا۔ مگر تم نے خود بتایا کہ سوائے ذو معنی باتوں کے اس نے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی بلکہ بہت عزت و احترام سے پیش آتا رہا۔ تو بات صاف ہو گئی کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتی رہی ہو۔ دیکھو بیٹی! معاف کر دو اُسے اور اُس کا ہاتھ تھام کر اپنی ماں کی تربیت کی لاج رکھ لو۔ مجھے یقین ہے اس بار اللہ تم پر اپنی رحمت کی برسات ضرور کرے گا۔“ انہوں نے التجائیہ لہجے میں کہا تو ان کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کئی آنسو ایک ساتھ چھلک پڑے تھے۔

☼☆☼

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

”تمہاری آواز سے اچھی تو یہ کڑوی دوائیاں ہی ٹھیک ہیں۔“

”وہ کیا کہتے ہیں، گھر کا مرغا دال برابر۔ تو میری مثال کچھ یونہی ہے۔“

”ارے نہیں بھئی، میرے بیٹے کی آواز تو بہت پیاری ہے۔“ شاہ زیب صاحب اندر آتے ہوئے خوش دلی سے بولے تو شہریار نے اکڑ کر شانزل کی جانب دیکھا تھا۔

”طبیعت کیسی ہے مائی سن؟“ وہ شانزل کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگے۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ بہت کمزور ہو رہے ہیں۔“ اُس نے دُکھی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ وہ جو باپ کے بجائے اس کے بڑے بھائی لگا کرتے تھے، ان دو ڈھائی ماہ میں ایک دم ہی نڈھال اور بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ اس کا دل تڑپ اٹھا۔

”اپنا خیال رکھا کریں ڈیڈی! یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے اپنی؟“

''سوچا تھا بیٹا جوان ہو جائے گا تو باپ کا خیال رکھے گا۔ مگر بیٹے کو تو اپنا بھی خیال نہیں۔''

''ڈیڈی...... ڈیڈی! آپ رو رہے ہیں؟'' اُن کے آنسو اس سے برداشت نہیں ہوئے۔

''نہیں ہے مجھ میں طاقت جوان بیٹے کو تکلیف سے تڑپتے دیکھنے کی۔ تم امریکہ جانے کی حامی کیوں نہیں بھرتے؟ کیوں مجھے کند چھری سے ذبح کر رہے ہو؟''

''مان جاؤ انکل کی بات۔ کیوں سزا دے رہے ہو اپنے ساتھ ان کو بھی۔'' شہریار نے بھیگے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔'' وہ طویل سانس لے کر گویا ہوا۔

''ساتھ ایک شرط اور بھی ہے۔''

''جی فرمایئے؟''

''تمہیں شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے کر جانا ہوگا۔''

''ڈیڈی!...... آپ مذاق کر رہے ہیں؟''

''نہیں۔ یہ تمہاری بہتری کے لئے ہے۔ شام کو تمہارا نکاح ہے اور کل فلائٹ سے تم اپنی بیوی کے ساتھ امریکہ علاج کے لئے روانہ ہو جاؤ گے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈیڈی آپ؟ میں مرتے ہوئے کسی کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔''

''ایک بار لڑکی سے تو مل لو، پھر کچھ کہنا۔'' اور اس کے بولنے سے قبل وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور وہ غصے سے ہونٹ بھینچے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

اُس نے بے حد جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ سامنے بیڈ پر سفید براق بستر پر نہ جانے سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زرد چہرے، بکھرے بالوں اور بے حد کمزور جسم والا یہ وہ شانزل تو نہیں تھا جس کی سرخ و سپید رنگت، بھرپور وجاہت اور اسمارٹنس کی لڑکیاں دیوانی تھیں۔

ان تین ماہ کے عرصے میں تو وہ بے حد بدل گیا تھا۔ وہ بے دھیانی میں آگے بڑھی تو کرسی سے ٹکرا گئی۔ آہٹ پر شانزل نے آنکھیں کھولیں تو جاگتے میں خواب کا گمان ہوا۔

حقیقت تھی یا خواب......؟

وہ سامنے تھی۔ ہر آہٹ پر جس ستم گر کے آنے کا گمان ہوتا تھا۔

''السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟'' اُس کی ایک ٹک گھورتی نگاہوں سے گھبرا کر وہ بول اٹھی۔

''یہ خواب نہیں، یہ وہی ہے۔ وہ جس کے تصور سے جسم کا سارا لہو، دل کی ساری دھڑکنیں، جذبوں کی ساری حدتیں، روح کی ساری لطافتیں، میری تمام سوچیں، قلب کی ساری خواہشیں جس کے پیکر سے موسوم تھیں۔ اس تمام عرصے میں وہ میرا عشق بن گئی تھی جس کا تصور میری نگاہوں میں بس گیا تھا۔ اس سے میرا وہی تعلق تھا جو جسم کا روح سے ہوتا ہے۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اُس کی وارفتہ نگاہوں اور محویت نے اُسے پزل کر ڈالا تھا۔

''تم بن ادھورا، بالکل بے روح وجود کی مانند۔ میں نے تمہیں چاہنے کا گناہ کیا ہے۔ مگر یقین کرو محبت اختیاری جذبہ ہوتی تو میں خود کو روک لیتا لیکن میں بالکل بے بس و مجبور ہو گیا۔ تمہیں دیکھا، سب سے الگ، بالکل انوکھی شخصیت لگی تمہاری۔ جلد ہی میں محسوس کرنے لگا تم وہی ہو جس کی مجھ کو تلاش تھی، جس کی میرے دل کو ضرورت تھی۔ وہ باتیں، وہ حرکتیں میں جان بوجھ کر کرتا تھا تاکہ تم مجھ سے بدظن ہو کر دور چلی جاؤ۔''

شدتِ تکلیف سے وہ لمحے بھر میں پسینے پسینے ہو گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔'' اُس کی بگڑتی حالت دیکھ کر وہ گھبرا کر بولی مگر اس نے منع کر ڈالا۔

''نہیں۔ پہلے میری بات سنو۔ تم نے میری ساری گستاخیوں کو سچے دل سے معاف کر دیا ناں؟''

''ہاں...... اور میں آپ کے ساتھ زیست کا سفر طے کرنے کو تیار ہوں۔''

''محبت خودغرض نہیں ہوتی خضریٰ! اب کچھ باقی نہیں بچا۔ میں تمہاری زندگی خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تمہیں پانا میری خواہش تھی جو حسرت بن گئی۔''

''نہیں شانزل، آپ کو میری خاطر پلٹنا ہے۔ میں نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں پائی۔ مگر اب میں خوشیوں سے دستبردار نہیں ہوں گی اور آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

وہ اس کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر رو دی تو اس کی سچی محبت اور چاہت پا کر شانزل کو اپنے مُردہ وجود میں نئی حیات کی توانائیاں ازسرنو بیدار ہوتی محسوس ہوئیں اور بیماری کو قوت مدافعت و ہمت سے زیر کرنے کی امنگیں توانا ہوگئی تھیں۔

''ارے...... ارے بھابھی جان! اب دلہنیں ہنستی مسکراتی وداع ہوتی ہیں۔'' اسی دم شہریار اندر آ کر بولا تو سٹپٹا کر اس نے شانزل کا ہاتھ چھوڑا تھا۔

''انکل! مت کیجئے گا اس کی شادی۔ انکار کر رہا ہے۔''

''نہیں...... نہیں۔ ڈیڈی کی بات میں نے کبھی نہیں ٹالی۔ اب بھی ماننے کو تیار ہوں۔'' وہ شوخی سے بولا تو شہریار ہنس پڑا تھا۔ خضریٰ ڈاکٹر کو بلانے کمرے سے نکل گئی اور بیٹے کی آنکھوں میں خضریٰ کا عکس دیکھ کر اب وہ مطمئن تھے کہ ان کا بیٹا کچھ تکلیف دہ مراحل سے گزر کر صحت مند زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔ بخوبی واقف تھے کہ شانزل اپنی پسندیدہ شے حاصل کر کے ہی سکون حاصل کرتا ہے۔

(ختم شد)